بدیسی مزاح
کرنل محمد خان
Dost

# بدیسی مزاح

(پاکستانی لباس میں)

کرنل محمد خان

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

# پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

---
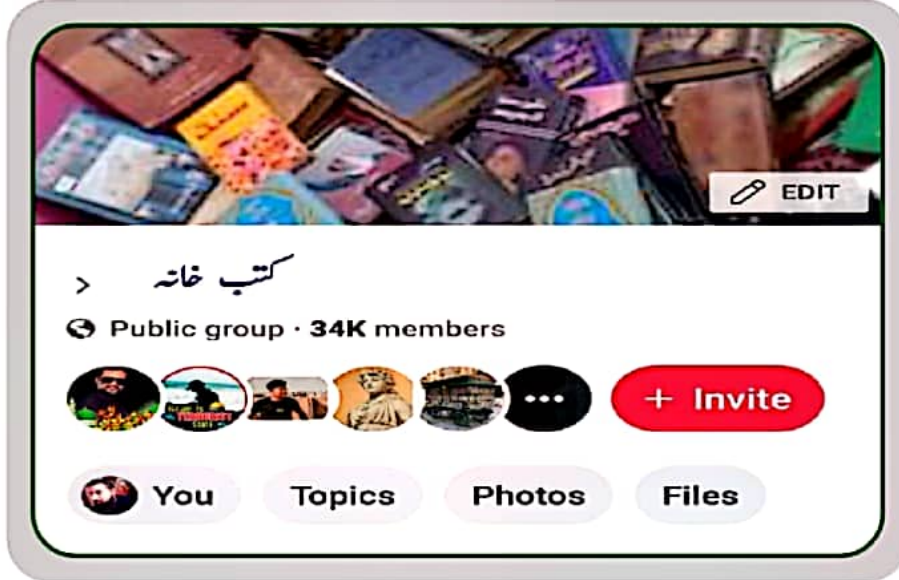

عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068


---

## ضابطہ

ISBN: 978-969-496-471-3

| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | بدیسی مزاح |
| مصنف | : | کرنل محمد خان |
| موسم اشاعت | : | 2016 |
| سرورق | : | خالد رشید |
| مطبع | : | سن گرافک |
| قیمت | : | 450.00روپے |

دوست پبلی کیشنز
پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، اسلام آباد
فون: 051-4102784-85
E-mail: dostpub@nayatel.pk

ہم نشینانِ چک لالہ

شفیق الرحمٰن، سید ضمیر جعفری، اسمٰعیل صدیقی

اور سلطان رشک کے نام

# ترتیب

# پیش لفظ

اس کتاب میں انگریزی زبان کے چند معروف اور چند غیر معروف مصنفین کے چھوٹے بڑے مزاح پاروں کے تراجم ہیں۔ یہ تراجم میں نے گذشتہ چند سالوں میں سہ ماہی جریدہ "اردو پنچ" کے لئے کئے تھے اور ان میں سے بیشتر چھپ بھی گئے مگر "اردو پنچ" کی محدود اشاعت کے باعث بہت کم قارئین تک پہنچ پائے۔ ویسے ممکن ہے کئی خواتین و حضرات انہیں انگریزی میں پڑھ چکے ہوں یا کسی دوسرے مترجم نے ان میں سے ایک آدھ مضمون کو اردو کا جامہ پہنا کر، کسی کثیر الاشاعت رسالے میں چھپوایا ہو۔ پی. جی. وڈ ہاؤس کے ایک دو مضامین کا ترجمہ میری نظر سے بھی گزرا ہے۔

انگریزی مضامین کا اردو میں یا اردو کا انگریزی میں ترجمہ آسان کام نہیں۔ خصوصاً اس صورت میں کہ مضامین ادبی نوعیت کے ہوں۔ "صحیح" ترجمہ تو غالباً اسی کو کہا جا سکتا ہے جو لفظ بہ لفظ کیا گیا ہو جسے انگریزی میں Faith Ful (باوفا) ترجمہ کہا جاتا ہے، مگر ایسا ترجمہ ادبی محاسن سے عاری ہوتا ہے یعنی خوبصورت نہیں ہوتا۔ اسی رعایت سے ایک مغربی دانشور کا قول ہے کہ (خواتین سے ہزار معذرت کے ساتھ) "ترجمہ عورت کی مانند ہے، اگر بہت خوبصورت ہو تو عموماً Faith Ful (باوفا) نہیں ہوتی اور وفادار ہو تو ایسی خوبصورت نہیں ہوتی"...... اب اس قول کی ذمہ داری تو گردنِ دانشور پر

ہی ہے مگر رہا میرا ترجمہ تو یہ بالکل Faith Ful نہیں بلکہ خاصا بے وفا ہے اگر چہ اس کی بے وفائی صرف الفاظ سے ہے۔ مصنف کے مطالب یا خیالات سے نہیں۔ اب اس بے وفائی سے ترجمے میں کتنی خوبصورتی پیدا ہوئی ہے یا کچھ ہوئی بھی ہے یا نہیں، قارئین ہی بتا سکیں گے۔

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ مزاح کا وہ احساس جو اوریجنل انگریزی پڑھتے وقت ہوتا ہے، میرے ترجمے میں نہیں۔ اس کی وجہ میرے عجزِ قلم کے سوا کچھ نہیں ورنہ خدا کے لیے ایسے بندے بھی ہیں جن کے تراجم اوریجنل کو بھی شرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیں پیرومرشد سید ضمیر جعفری کا ''ولایتی زعفران'' جو انگریزی نظموں کے منظوم اردو تراجم پر مشتمل ہے اور بلا شبہ اوریجنل سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔

میں نے ان کہانیوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک یہ التزام کیا ہے کہ ان کے کرداروں کو انگریزی ناموں کی بجائے پاکستانی نام دیئے ہیں۔ پس نظر (یعنی مقامات وغیرہ) بھی پاکستان میں مہیا کیا گیا ہے۔ نتیجتاً کہانیوں کا ماحول بھی فرنگی کی بجائے پاکستانی ہو گیا ہے۔ میں نے ایسا کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ عام پاکستانی قاری جو انگریزی زبان یا مغربی رسوم اور جغرافیے سے اچھی طرح واقف نہیں، کہانی کو پوری طرح سمجھ سکے۔ پاکستان میں انگریزی دان حضرات کی نسبت ایسے ہی قارئین کی کثرت ہے اور کچھ یہ بھی ہے کہ عام قاری کو ہیر رانجھے شہوار اور سلمان کی کہانیاں مس لوسی اتھرنگٹن یا مسٹر رابرٹس ٹاملنسن کے افسانوں سے زیادہ دلچسپ اور اپنی زندگی کے قریب لگتی ہیں۔ اگر آپ کو میری بات سے اتفاق نہیں تو ضرور اختلاف کریں۔ یہ آپ کا حق ہے۔

اس مجموعے کے مصنفین کے نام اور ان کی کہانیوں کے انگریزی عنوان ہر کہانی کے پہلے صفحے پر فٹ نوٹ میں رومن الفاظ میں دیے گئے ہیں۔

والسلام

کرنل محمد خان

165 چکلالہ 3۔ راولپنڈی

24 اپریل 1991ء

# طوسی کا طوطا

مسٹر ایف۔ اے۔ طوسی ہمارے محلے کے سب سے سینئر مکین ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے بہت بڑے افسر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں مگر وہی دیرینہ اکڑ باقی ہے۔ دراصل آپ کا تعلق ایک ایسے محکمے سے تھا جس میں اکڑ اور پھکڑ کا ملکہ اہلیت کے خانے میں درج کیا جاتا ہے۔ آج کل محلے کے دوسرے لوگوں سے نہ صرف جسمانی بلکہ زبانی فاصلے پر بھی رہتے ہیں۔ اگر کبھی زبان کا استعمال کرنا ہی پڑے تو بڑے سرپرستانہ لہجے میں بات کرتے ہیں جیسے کسی فرعون کو غریب پروری کا دورہ پڑ گیا ہو اور اگر کبھی سچ مچ جلال میں آ جائیں تو پھر دو مذکورہ بالا خداداد اہلیتوں کا کچھ اس انداز سے مظاہرہ کرتے ہیں جیسے سارے محلے کو اندر کر دیں گے۔ شنید ہے کہ اپنے گھر میں نوکروں کے علاوہ بے چاری بیگم کو بھی مستقل طور پر اندر کر رکھا ہے۔

میں ایک سکول ٹیچر ہوں۔ تعلیم کے لحاظ سے تو طوسی صاحب مجھ سے خاصے پیچھے ہیں لیکن عہدے میں میلوں آگے ہیں یا تھے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں بہت حلیم اور میٹھی طبیعت کا مالک ہوں لیکن میں فرعون بھی نہیں ہوں۔ ہاں فرعونوں سے ٹکر لینے میں مزا آتا ہے اور حتی المقدور لے لیتا ہوں۔

محلے داری کی وجہ سے طوسی صاحب اور میں ایک دوسرے کو جانتے ضرور ہیں لیکن کبھی ان

کے ساتھ خندہ پیشانی بلکہ سادہ پیشانی سے بھی ہمکلامی کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر پچھلے دنوں کرنا خدا کا کیا ہوا کہ طوسی صاحب سے سچ مچ ٹکر ہوگئی۔ جسمانی نہیں، قلمی! اور ٹکر کا باعث تھا ایک طوطا! یا یوں کہہ لیں کہ طوسی کا طوطا۔

یہ ایک پیلے رنگ کا باتونی سا طوطا تھا جو خدا جانے کن حالات میں ایک دن اپنے مالک کے گھر سے نکلا اور اڑتا اڑتا میرے ہاں مہمان آٹھہرا۔ اس پر میں نے طوسی صاحب کو خط لکھا:

محترم طوسی صاحب.................السلام علیکم!

اس خط کا مدعا آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے۔ کیا آپ کا کوئی طوطا گم ہوگیا ہے؟ سوال پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ آج دوپہر کو طوطے کی نسل کا ایک پرندہ میری خواب گاہ کی کھلی کھڑکی سے اچانک میرے گھر میں داخل ہوگیا، بالکل برضا ورغبت۔ کیونکہ ہم لوگوں نے اسے کوئی دعوت دی تھی نہ ترغیب۔ اور اب وہ کمرے کی انگیٹھی پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہے جیسے یہ گھر اسی کا ہو۔ مسلسل باتیں کئے جارہا ہے جو ابھی پورے طور پر ہمارے پلے نہیں پڑتیں۔

مجھے شک سا ہے کہ یہ طوطا آپ کا ہے لیکن ظاہر ہے کہ محض شک کی بنا پر میں اسے آپ کے حوالے نہیں کرسکتا۔ سو، اگر آپ نے واقعی کوئی طوطا کھویا ہے تو براہِ کرم اس کے حلیہ سے آگاہ کریں۔ میں انشاءاللہ پوری احتیاط سے حلیے کا طوطے سے مقابلہ کروں گا۔ اگر حلیہ سو فیصد درست نکلا تو اپنی پہلی فرصت میں طوطا آپ کو لوٹا دوں گا۔ ہاں اگر طوطے نے اخلاقی وجوہ کی بنا پر واپس جانے میں مزاحمت کی تو اس صورت میں آپ کو طوطے کے جذبات واعتراضات سے آگاہ کردوں گا۔

مخلص خادم حسین

طوسی صاحب نے فوراً جواب دیا

ماسٹر خادم حسین!

تمہارے احمقانہ خط کے جواب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا طوطا فی الواقعہ گم ہوگیا

ہے اور مجھے یقین ہے کہ خط لکھتے وقت تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ طوطا میرا ہی ہے۔ یہ بچہ تھا کہ میرے گھر میں آیا اور تین سال سے میرا ساتھی ہے۔ ان حالات میں شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ تم اسے غیر مشروط طور پر میرے حوالے کر دیتے اور معاملہ ختم ہو جاتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم ماسٹر لوگوں کو شرافت کے تقاضوں سے بہت شناسائی نہیں۔ غالباً تم بڑے آدمیوں کو فضول خط لکھ کر اپنی اہمیت جتانے کا موقع ڈھونڈتے رہتے ہو۔ یہ گھٹیا حرکت ہے۔

اب تمہارے لئے ایک ہی صحیح راستہ ہے کہ حامل ہذا کو فی الفور طوطا دے دو اور آئندہ مجھے خط لکھنے کی کوشش نہ کرو۔

نوٹ:

تم نے طوطے کا حلیہ پوچھا ہے۔ طوطے کا حلیہ کیا ہوتا ہے؟ بس طوطا ہے اور پیلے رنگ کا ہے۔

ایف اے طوسی

قارئین: ملاحظہ فرمایا آپ نے مسٹر طوسی کا طرزِ تخاطب اور ان کی جھنجھلاہٹ؟ اب میں ہزار خاکسار سہی لیکن عرض کیا ہے ناکہ فرعونوں سے ٹکر لینے میں مزا آتا ہے مگر کسی جھنجھلاہٹ کے بغیر۔ سو عرض کیا:

جناب طوسی صاحب...... السلام علیکم

آپ کا نامہ ملا۔ جس کے ابتدائی الفاظ نے مجھے آپ کی شرافت اور شائستگی کا گرویدہ کر لیا ہے۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے.......... لیکن اگر مجھے تبصرے کی اجازت دیں تو عرض کروں گا کہ ہر چند کہ آپ کی تکنیک بے عیب ہے اور آپ کے سابقہ محکمے کی روایات کی آئینہ دار ہے تاہم میرے خط کے جواب کے طور پر آپ کا گرامی نامہ ذرا بے کار ہے۔ موضوعِ زیرِ بحث کے پیشِ نظر ضرورت اس بات کی تھی کہ شرافت پر لیکچر دینے کی بجائے (یا علاوہ) اپنے گم شدہ طوطے کا مفصل حلیہ بیان فرماتے۔ طوطے کا محض بیرونی رنگ بتا دینا کافی نہیں فطرت نے یہ رنگ آپ کے طوطے

کے علاوہ بے شمار دوسرے طوطوں کو بھی عطا کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ اپنے طوطے کی عادات پر روشنی ڈالتے، اس کے کمالات کا ذکر کرتے اور اس کے پروں کے رنگ کی بجائے اس کی گفتار کا ڈھنگ بیان فرماتے۔

پھر آپ نے طوطے کا حلیہ بیان کرنے میں بھی بڑی کفایت بلکہ گستاخی معاف، قبض سے کام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی تنگ شہادت کی بنا پر میں طوطا واپس کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب نہیں سمجھتا۔ بے شک طوطے کا رنگ پیلا ہی ہے لیکن میں نے محلے کے دوسرے لوگوں سے تا حال دریافت نہیں کیا ورنہ بالکل ممکن ہے کسی اور کا طوطا بھی گم ہو گیا ہو اور اتفاق سے اس کا رنگ بھی پیلا ہو۔ سو امید ہے مفصل حلیے کی ضرورت حضور کی سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ چنانچہ اگر اس خط کا جواب دینا پسند فرمائیں تو شرافت کی بقیہ فلاسفی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ طوطے کے کوائف پر بھی مفصل روشنی ڈالیں۔

مخلص خادم حسین

اس خط سے طوسی صاحب ذرا زیادہ سیخ پا ہو گئے۔ جواب آیا:

ماسٹر خادم حسین!

خدا تمہیں غارت کرے۔ تم جانتے ہو کہ طوطا بلا شبہ میرا ہے مگر تم نے خواہ مخواہ حلیے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بتا تو دیا ہے کہ اس کا رنگ پیلا ہے۔ کم گو ہے اور جیسا کہ اس نسل کے طوطوں کا دستور ہے اپنے سر کو ایک طرف لٹکا کر رکھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ حلیہ کیا ہوتا ہے۔

بہر حال اب حلیہ بھول جاؤ اور طوطا فی الفور واپس کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں قانونی کارروائی پر مجبور ہو جاؤں گا۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ کسی دوسرے کے مال پر قبضہ کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ یہ علم تمہیں جلد ہی ہو جائے گا.......... تم شاید بھول رہے ہو کہ میرا نام طوسی ہے.......... نوابزادہ فخر عالم طوسی۔

ایف اے طوسی

میرا جواب تھا:

جناب طوسی صاحب.......... السلام علیکم!

جنابِ والا کا الٹی میٹم ملا۔ وہ اپنی جگہ پر مگر مجھے مکرر عرض کرنے کی اجازت دیں کہ آپ کا بیان کردہ حلیہ ناکافی ہے۔ ناکافی ہی نہیں' نادرست بھی ہے۔ کیونکہ یہ طوطا کسی عنوان سے کم گو نہیں کہلا سکتا۔ بے حد بسیار گو ہے اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں' فحش گو بھی ہے۔ جیسا کہ بار بار عرض کر چکا ہوں اگر آپ اپنے طوطے کے چند پسندیدہ الفاظ یا جملے بتا دیتے تو اس کی ملکیت کے تعین میں بے حد ممد ثابت ہو سکتے مجھے اس سے ہرگز انکار نہیں کہ یہ رنگ کا پیلا ہے اور سر لٹکا کر رکھتا ہے لیکن اکثر پیلے طوطوں کا سر تھامنے کا یہی انداز ہے۔ شناخت کے لئے فیصلہ کن چیز طوطے کا نمونہ کلام ہی ہے اور کچھ نہیں۔

باقی رہی آپ کی عدالت میں جانے کی دھمکی تو میری کیا مجال کہ آپ کو اُس دربار میں جانے سے روکوں۔ صرف ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ اگر عدالت نے طوطے کو بھی شہادت کے لئے طلب کر لیا تو اس کی شہادت بند کمرے میں دلوایئے گا ورنہ مجھے خوف ہے کہ اس کی فصاحتِ دشنام اس کے سکھلانے والے کو فحاشی پھیلانے کے جرم میں پکڑوا سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ طوطے کے آموزگار آپ ہی ہیں اور شاید یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہو کہ آج کل فحاشی پھیلانے کی سزا میں کوڑے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ وِ ماعلینا الا البلاغ۔

آپ نے اپنے نامہ گرامی کی ابتداء ایک دعائیہ جملے سے کی ہے اور خدا تعالیٰ کو مجھے غارت کرنے کی زحمت دی ہے۔ خدا کا شکر ہے آپ نے یہ معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا ہے جو عادل و قادر ہے اور محض کسی کی لگائی بجھائی پر غریبوں کو غارت نہیں کر دیتا ورنہ زیادہ ممکن تو یہ تھا کہ یہ ڈیوٹی آپ کسی قابلِ اعتماد غنڈے کے ذمے لگا دیتے۔ اس صورت میں آپ خاصے مثبت نتائج کی توقع رکھ سکتے تھے۔

آخر میں مجھے یہ علم تھا کہ آپ کا اسمِ گرامی طوسی ہے اور میں اسے بالکل نہیں بھولا تھا' البتہ یہ کہ حضور نوابزادہ بھی ہیں' میرے علم میں ایک ہیبت ناک اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ناگہانی بلاؤں

سے محفوظ رکھے' آپ کو بھی اور مجھے بھی۔

مخلص خادم حسین

طوسی صاحب نے جواب میں لکھا!

ماسٹر خادم حسین!

تم میرے اندازے سے زیادہ پاجی نکلے ہو۔ ایک معمولی سکول ٹیچر ہوتے ہوئے یہ گستاخی کہ میرے طوطے کو بدزبانی کا مجرم ٹھہرا رہے ہو۔ یہ ٹھیک ہے تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میرا طوطا کئی روز سے تمہاری صحبت میں رہ رہا ہے ورنہ جب تک یہ میرے گھر میں تھا' شیریں گفتاری کا نمونہ تھا جیسے اس کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہو۔ آخر اس کی تمام تر تربیت یا خود میں نے کی ہے یا میری بیگم نے۔ دریں حالات یہ اور ضروری ہو گیا ہے کہ میرا طوطا موجودہ بیہودہ صحبت سے بعجلت تمام الگ کیا جائے۔ چنانچہ کل صبح تک تم نے طوطا واپس نہ کیا تو اگلی دفعہ تمہیں خط کی بجائے عدالت کے سمن ملیں گے۔

ایف اے طوسی

جناب طوسی صاحب............اسلام علیکم!

بے شک ایک سکول ماسٹر کے مقابلے میں آپ ایک بہت بڑے (سابق) افسر ہیں لہٰذا آپ کا فرمودہ سر آنکھوں پر لیکن ایک اختلاف کی اجازت چاہتا ہوں اس طوطے کی زبان اگر کسی پانی میں دُھلی ہے تو یقیناً کوثر و تسنیم نہیں ہو سکتے۔ زیادہ ممکن یہ ہے کہ اس نے آپ سے آنکھ بچا کر کسی گٹر میں چونچ تر کر لی ہو۔ رہا میری صحبت کا اثر تو قبلہ' آپ اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے یقیناً جانتے ہوں گے کہ بوڑھے طوطے بلکہ انسان بھی سیکھا نہیں کرتے۔ اگر یہ آپ ہی کا طوطا ہے تو آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس نے اپنی تمام تر طالب علمی کا زمانہ آپ اور آپ کی بیگم محترمہ کے زیرِ سایہ گزارا ہے اور گھر سے مکمل طور پر فارغ التحصیل ہو کر نکلا ہے۔

رہی صحبت کی بات تو یقین جانیں کہ اگر میں چندے اور اس طوطے کی صحبت میں رہا تو میں محکمہ پولیس کے علاوہ کسی دوسری جگہ ملازمت کے قابل نہ رہوں گا۔ دوسرے لفظوں میں میرا موجودہ روزگار چھن جائے گا۔ ان حالات میں اگر کل تک آپ اس طوطے کی ملکیت کا کوئی حتمی ثبوت بہم نہیں پہنچاتے تو میں اسے دارالامان کے حوالے کر دوں گا۔ والسلام

مخلص خادم حسین

جواب آیا:

ماسٹر خادم حسین!

مجھے ضرورت نہ تھی کہ تمہارے آخری بیہودہ خط کا جواب دیتا کیونکہ یہ معاملہ میں اپنے وکیل کے سپرد کر چکا ہوں۔ میں تمہیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم ایک نہایت بدتمیز، بے ادب اور گستاخ آدمی ہو۔ آدمی کہاں؟ ماسٹر ہو چند ٹکے کے۔

ایف اے طوسی

قارئین............ آپ شاید حیران ہوں گے لیکن اگلی صبح میں نے طوطا طوسی صاحب کو واپس کر دیا۔ کیا میں نے طوسی صاحب کے خوف سے ایسا کیا؟ یا عدالت کے ڈر سے؟ آپ ذرا ذیل کا رقعہ پڑھیں جو میں نے طوطے کے ہاتھ طوسی صاحب کو بھیجا۔

جناب طوسی صاحب!

آپ کا طوطا ارسالِ خدمت ہے۔ وہ ثبوت جو آپ بہم نہ پہنچا سکے' خود طوطے نے بہم پہنچا دیا ہے۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ یہ طوطا آپ ہی کی ملکیت ہے اور اگر کسی اور کا ہے تو اس کا نام بھی طوسی ہوگا۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اس محترم نام کے مالک پورے شہر میں آپ ہی ہیں۔

ہوا یہ کہ ہم ناشتہ کر رہے تھے کہ حسب معمول طوطے نے ابتدائے کلام کی۔ اس سے پہلے وہ لفظ ''تم'' سے بات شروع کرتا تھا اور پھر ایک نہایت مرصع تھانیدارانہ گالی سے آغاز سخن کرتا تھا

اور ہم چار و نا چار مزید کلام کی تاب نہ لاتے ہوئے ناشتہ اٹھا کر باہر صحن میں نکل جاتے تھے لیکن آج خلافِ معمول اس کے منہ یا چونچ سے پہلا لفظ جو نکلا وہ آپ کا اسمِ گرامی تھا۔ اچانک بولا ''طوسی'' اور پھر جملہ مکمل کیا۔

''طوسی جائے............ میں''

یہ خالی جگہ طوطے نے نہیں' میں نے چھوڑی ہے۔ میری مجال نہیں کہ خالی جگہ کو اسی لفظ سے پُر کردوں جسے طوطے نے بالتواتر اور بہ اصرار پُر کیا۔ یہ گرائمر کی رو سے ایک طرح کا دعائیہ جملہ تھا............ جسے آپ کے نقطۂ نگاہ سے بددعائیہ بھی کہا جا سکتا ہے............ جس سے طوطے کا مدعا یہ تھا کہ خدائے بزرگ و برتر آپ کو یہاں سے اٹھا کر وہاں لے جائے ''یہاں سے وہاں'' تک سے اس کی مراد یہ نہ تھی کہ اس محلے سے اس محلے میں بلکہ اس دنیا سے اگلی دنیا میں مستقل طور پر منتقل کر دے۔ اور کم بخت نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اگلی دنیا کی دو ممکنہ قیام گاہوں میں سے آپ کے لئے اس مقام پر نزولِ اجلال کی سفارش کی جو نسبتاً زیادہ گرم ہے۔ بہت زیادہ گرم۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں آپ کے طوطے نے اس مقام کا ٹیکنیکل نام بھی لیا جو ترنم کا ہم قافیہ ہے مگر اس کا دہرانا میری زبان کو زیب نہیں دیتا۔ آپ یقیناً اپنے طوطے کا منشا سمجھ گئے ہوں گے اور اس مقام کے صحیح نام اور اس کی آب و ہوا کا بھی آپ کو اندازہ ہوگا۔ یقین مانیں کہ میں نے طوطے کے منہ سے جب پہلی مرتبہ یہ دعا سنی تو اسے بہت جھڑکا کہ اپنے مالک اور محسن کے لئے کوئی دعا مانگنا ہی ہے تو کسی معتدل جگہ کی دعا مانگو مگر وہ ضدی پرندہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہا اور اپنی دعا میں ترمیم کرنے سے یکسر انکار کرتا رہا۔

میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ یہ دعا طوطے نے میرے گھر میں نہیں سیکھی مجھے آپ سے ہزار اختلاف سہی مگر مجھے آپ کے انتقال میں کوئی فوری دلچسپی نہیں۔ بہر حال مرنے کے بعد بہشت و دوزخ کا فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن میری دعا ہمیشہ یہی رہے گی کہ آپ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ اب رہا یہ کہ یہ دعا یا بددعا اسے کس نے سکھلائی تو آپ کے بیان کے مطابق طوطے نے

بچپن سے اب تک صرف دو استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، آپ کے سامنے اور آپ کی بیگم صاحبہ کے سامنے۔ میں بی جمالو نہیں بننا چاہتا مگر ظاہر ہے کہ یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے۔ کوئی تیسرا شخص اس میں ملوث نہیں۔ سؤا سے خوش اسلوبی سے گھر میں ہی طے کر لیں۔ بظاہر بیگم صاحبہ کا بھی اتنا قصور نہیں جتنا آپ کو پہلے لمحے میں نظر آئے گا۔

بہر حال میں خوش ہوں کہ مجھے جس شخص کی تلاش تھی، وہ مل گیا ہے یعنی طوطے کا مالک اور وہ بلاشبہ آپ ہی ہیں۔ یہ طوطا بوجوہ بدزبان ضرور ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا خانہ زاد ہے۔ سؤا اس کی بازیابی پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ والسلام

مخلص خادم حسین

میں طوسی صاحب سے آج تک دو شکریے کے الفاظ کا منتظر ہوں۔ خدا جانے وہ مجھ سے بولنا نہیں چاہتے یا شاید اس دوران طوطے کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ دوسری صورت میں اللہ تعالٰی انہیں مغفرت کرے اگرچہ طوطے نے ہماری دعا سن لی تو سخت برہم ہوگا۔

# ہورانی' آؤ جانی

جب سے محکمہ زراعت نے اعلیٰ نسل کی گائیوں کے مقابلے منعقد کر کے لاکھوں روپے کے انعامات دینا شروع کیے ہیں' بڑے بڑے زمینداروں نے گائیں پالنا شروع کر دی ہیں۔ مگر گذشتہ دو سال سے پہلا انعام نواب سعادت علی خاں کی چیمپئین گائے مسماۃ رانی کے علاوہ کوئی گائے نہیں جیت سکی بلکہ اس سال 12 مارچ کو تیسری مرتبہ بھی نقد انعام کے علاوہ سنہری تمغہ بھی رانی ہی نے جیتا مگر بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ رانی کا آخری لمحے تک مقابلے میں شریک ہونا ہی مشکوک تھا۔ آیئے' دیکھیں کیا گزری تھی قطرے پہ گہر ہونے تک:

اس دلچسپ واقعہ کی ڈائری کچھ یوں ہے:

پیر 8 مارچ: نواب سعادت علی خاں کا نوکر نوراجو رانی کی خدمت پر مامور تھا' پولیس نے گرفتار کر لیا۔ جرم تو ایسا سنگین نہ تھا۔ فقط جوئے خانے کے گرد گھومتا پایا گیا تھا لیکن عدالت میں کچھ صفائی پیش نہ کر سکا اور مہینے بھر کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

اگلے روز (یعنی منگل 9 مارچ کو) رانی نے چارہ کھانے بلکہ سونگھنے تک سے انکار کر دیا حالانکہ گائیوں کے حلقے میں رانی بڑی خوش خوراک اور تیز ہاضمے کی مالک سمجھی جاتی تھی۔ نواب

"Pig-Hoo-o-o-o Ey" By wodehouse

صاحب نے مقابلے سے دو ہی دن پہلے اپنی گائے کو مائلِ فاقہ دیکھا تو حواس کھو بیٹھے۔ ہر چند کہ پیدائشی بدحواس ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کھونے کو بہت کچھ نہ تھا۔ بہرحال اتنی سوچ ان کے ذہن کے کسی کونے سے آگئی کہ اگر رانی فاقہ کشی پر مصر رہی تو اس کے جسم کی ریشمی چمک ماند پڑ جائے گی اور انعام نہ لے سکی تو بھرے دربار میں کرکری ہو جائے گی: چنانچہ اور کچھ نہ سوجھا تو جوتوں سمیت دعا مانگنے لگے "یا اللہ رانی کو کھانے کی توفیق بخش" ...... یہ کہہ کر دعا کی قبولیت کی آزمائش کے طور پر رانی کو سبز چارا پیش کیا۔ رانی نے نواب صاحب کو کسی قدر حقارت سے دیکھا اور منہ موڑ لیا۔ پھر اچانک نواب صاحب کو خیال آیا کہ گائے بھینسوں کے تو ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں' چنانچہ فی الفور وٹرنری ڈاکٹر درّانی کو بلایا۔ ڈاکٹر درّانی نے پورے دو گھنٹے رانی کا معائنہ کیا مگر اسے کوئی بیماری نظر نہ آئی۔ بے بس ہو کر بولا:

"نواب صاحب! رانی کا روگ میرے فہم سے بعید ہے۔ غالباً یہ روحانی عارضہ ہے، جسمانی نہیں۔"

ڈاکٹر کے الفاظ نواب صاحب کو یوں لگے جیسے اس نے ان کے کسی عزیز کی نبض دیکھ کر کہہ دیا ہو کہ اب دوا کی ضرورت نہیں۔ بس دعا کرو اور دعا کر کے وہ پہلے ہی فیل ہو چکے تھے۔ نواب صاحب نے ڈاکٹر درّانی کو غضب سے دیکھا جیسے کہتے ہوں' نالائق کہیں کا" مگر کچھ کہے بغیر اسے رخصت کر دیا۔

نواب سعادت یوں تو خوش باش' بے فکرے اور احمق سے رئیس تھے مگر رانی کی علالت نے ان کی خوش باشی اور بے فکری چھین لی۔ البتہ احمق وہ حسبِ سابق ہی رہے یا قدرے احمق تر۔

ڈاکٹر درّانی دروازے سے نکلے ہی تھے کہ نواب صاحب کی بڑی بہن بلقیس (جس نے عمر بھر شادی نہیں کی تھی) داخل ہوئی۔ نواب سعادت، رانی کی علالت اور اپنی بدحواسی کی مشترکہ دھند میں گم تھے۔ پہلے تو اپنی بہن کی موجودگی ہی سے غافل رہے، مگر جب وہ بالکل قریب آ کھڑی ہوئی تو حسبِ عادت تین چار مرتبہ پلکیں جھپکنے کے بعد بولے:

''آپا' آپ ہیں!''

''ہاں! میں ہوں' سعادت''

آپ نے صرف چار لفظ بولے لیکن اس انداز سے جیسے وہ بھی کسی شدید پریشانی میں مبتلا ہو اور پریشانی اس کی یہ تھی کہ شاذیہ نے جوان دونوں کے مرحوم بھائی کی بیٹی تھی اپنے منگیتر رئیس زادے سکندر سے منگنی توڑ دی تھی: چنانچہ آپا بلقیس ایک کرب کے عالم میں بولی:

''سعادت' غضب ہو گیا۔ کچھ تم نے بھی سنا ہے؟''

نواب سعادت بولے:''ہاں سنا ہے، وہ ابھی مجھے بتا کر گیا ہے۔''

''بتا کر گیا ہے؟ کیا وہ تمہارے پاس آیا تھا؟''

ہاں' ہاں: ابھی تو رخصت ہوا ہے۔''

''تو اسے جانے کیوں دیا؟ تمہیں معلوم نہ تھا کہ میں بھی اس سے دو باتیں کرنا چاہوں گی؟''

''آپا' تمہارے ملنے سے کیا فائدہ ہوتا؟''

''بھئی میں کم از کم اس سے ہمدردی کا اظہار تو کر سکتی۔''

''ہمدردی؟ آپا' وہ گدھا ہمدردی کا مستحق نہیں۔''

''سعادت۔ کیا بیوقوفوں کی سی باتیں کر رہے ہو؟ وہ تو وجیہ اور ذہین نوجوان ہے''

''جوان؟ کمال کرتی ہو آپا۔ اس ساٹھ سال کے بڈھے کو جوان کہتی ہو؟''

''تمہیں ہو کیا گیا ہے سعادت! سکندر ساٹھ سال کا؟ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو اس نے اپنی پچیسویں سالگرہ منائی ہے۔''

''آپا' سکندر نہیں' درانی۔''

یہ پہلی بار نہیں تھی کہ آپا بلقیس نے اپنے بلند اقبال مگر کم عقل بھائی کی بے سروپا باتیں سنی ہوں۔ اسے بھائی سے باتیں کرتے ہوئے ہمیشہ احساس رہتا تھا جیسے کسی نیم خوابیدہ شخص سے

مخاطب ہو۔

سعادت! آپا نے ذرا خشمگین ہوکر کہا'' خدا کے لئے صرف اتنا بتا دو کہ تم باتیں کس کے متعلق کر رہے ہو؟''

''ڈاکٹر درّانی کے متعلق' اور کس کے متعلق؟ نالائق کہتا ہے' رانی کی بدہضمی روحانی ہے اور اس کے پاس کوئی علاج نہیں۔ وٹرنری بنا پھرتا ہے''

آپا بلقیس نے مایوسی میں ایک لمبا سانس لیا اور بولی۔

''تو پھر میرے پیارے مگر بھولے بھائی تم نے وہ خوفناک خبر نہیں سنی جو میں سن چکی ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہماری بھتیجی شاذیہ نے سکندر کے ساتھ منگنی توڑ دی ہے۔''

''اچھا؟ اور گائیوں کی نمائش میں صرف دو دن باقی ہیں۔''

آپا بلقیس بلبلا اٹھی مگر غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی: ''نمائش کا شاذیہ کی منگنی سے کیا تعلق؟''

''تعلق؟'' نواب سعادت نے جیسے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا'' تعلق بھی کچھ ہوگا ہی مگر اصل بات یہ ہے کہ نمائش سر پر آ گئی ہے اور میری چیمپئن گائے رانی بھوک ہڑتال کئے بیٹھی ہے۔''

''جہنم میں جائے تمہاری رانی'' آپا بلقیس پھٹ پڑی۔'' دیکھو سعادت۔ خدارا سنو اور سمجھو۔ یہ گائے بھینسوں کے ہاضمے سے کہیں زیادہ نازک معاملہ ہے۔ میں تمہیں بتا رہی تھی کہ ہماری پیاری بھتیجی شاذیہ نے خان بہادر نوازش حسین کے بیٹے سکندر کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی ہے اور صرف یہی نہیں وہ اس نکمے ارشد کے ساتھ شادی کرنے پر تل گئی ہے۔''

کون ارشد؟ مولوی بدرالدین کا لڑکا؟

''ہاں: وہی جو مسجد کے ٹکڑوں پر پلا ہے۔''

یہ ارشد کے ساتھ شادی کیسے کر سکتی ہے؟ وہ تو امریکہ میں کسی کورس کے لیے چنا گیا تھا۔"

"وہ امریکہ میں نہیں، لاہور میں ہے۔" آپا سعادت بولی۔

"نہیں، نہیں...... وہ لاہور میں نہیں ہو سکتا مجھے اچھی طرح یاد ہے، دو سال ہوئے وہ مجھے ایئرپورٹ پر ملا تھا۔ اس کے ہاتھ میں امریکہ کا ٹکٹ تھا۔ یقیناً اب تک پہنچ چکا ہوگا۔"

"امریکہ چند گھنٹے کا راستہ ہے، میرے بدھو بھائی اور دو سالوں میں اتنے گھنٹے ہوتے ہیں کہ وہ نہ صرف وہاں پہنچ سکتا ہے بلکہ واپس بھی آ سکتا ہے...... چنانچہ وہ واپس آ چکا ہے۔"

نواب سعادت جیسے کسی بڑے مسئلہ کے حل ہو جانے پر بولے: "اچھا تو وہ واپس بھی آ گیا ہے؟"

"شکر ہے اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں آ گئی" آپا بلقیس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب سنو۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک وقت شاذیہ اور ارشد کے درمیان ایک بے مقصدی چاہت سی تھی جو ایک عرصے تک لشٹم پشٹم چلتی رہی لیکن جب وہ امریکہ چلا گیا تو شاذیہ اسے بھول بھال گئی اور بڑے چاؤ سے سکندر سے منگنی بھی کر لی۔ لیکن اب یوں لگتا ہے جیسے ارشد کی واپسی پر شاذیہ کی پرانی محبت جاگ اٹھی ہے۔ آج صبح اچانک مجھے کہنے لگی: "میں نے سکندر کو بتا دیا ہے کہ منگنی ختم"...... کتنے شرم کی بات ہے؟"

نواب سعادت علی خان گہری سوچ میں تھے۔ آخر بولے تو فرمایا: "میں نے خشک گھاس آزمائی ہے۔ سبز چارا بھی دیا ہے۔ حتیٰ کے ابلے ہوئے آلو کھلانے کی بھی کوشش کی ہے مگر وہ کسی چیز کو منہ ہی نہیں لگاتی۔"

بھائی کی بات سن کر آپا بلقیس کی آنکھوں سے کچھ ایسی آتش کے شعلے اٹھے کہ نواب صاحب کو اپنے جسم پر چھالے ابھرتے محسوس ہوئے۔ نتیجتاً ایک جھٹکے کے ساتھ ہوش میں آئے اور بولے:

"منگنی توڑ دی؟ کیا بدتمیزی ہے! لاحول ولاقوۃ............ بہرحال میں اس نوجوان سے بات کروں گا اگر اس کا یہ خیال ہے کہ میری بھتیجی کو یوں جھٹک کر چلتا بنے گا تو میرا نام بھی سعادت نہیں۔"

''نام تو تمہارا سعادت ہی ہے۔'' آپا کسی قدر نفرت سے بولی'' مگر یہ بتاؤ کہ تم ہوش میں بھی ہو؟''

نواب صاحب نے دس بارہ دفعہ تیزی سے آنکھیں جھپکیں۔ انہیں محسوس تو ہو گیا کہ کوئی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ کیا غلطی کی ہے بلکہ انہوں نے تو اپنے زعم میں غصے اور طاقت کا مظاہرہ کیا تھا کہ اسی کا وہ نوجوان مستحق تھا۔ بہرحال ڈرتے ہوئے بولے:

''کیوں آپا۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟''

''منگنی شاذیہ نے توڑی ہے۔ نوجوان سکندر کا کوئی قصور نہیں۔''

''اچھا؟''

''اور سکندر سے توڑ کر اب مولوی زادے ارشد پر ریجھنے لگی ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ ہم دونوں کیا کریں۔'' آپا بلقیس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا کریں؟'' نواب سعادت نے ڈٹ کر کہا۔'' ہم نہایت سخت قدم اٹھائیں گے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ ہم انہیں شادی کا تحفہ نہیں بھیجیں گے۔''

آپا بلقیس اپنے بھائی کی حماقت پر سر پیٹ لینے کو تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی اندر داخل ہوئی۔ کیا حسین لڑکی تھی! سنہری بال اور نیلی آنکھیں۔ بالکل مے خانے سے! لیکن جس انداز سے ان دو نیلی آنکھوں نے نواب سعادت کو دیکھا انہیں مے خانے کی بجائے تازیانے لگے۔ نواب صاحب کی پریشانی دیدنی تھی کہ یہ قاتل آنکھیں ان کی بھتیجی شاذیہ کی تھیں جسے وہ عام حالات میں بے حد پیار کرتے تھے۔ اب بھی اسے خوش کرنے کے لئے اور کچھ نہ سوجھا تو پوچھنے لگے:

شاذیہ بیٹے! تمہیں کچھ مویشیوں کے متعلق بھی علم ہے۔ میرا مطلب ہے گائے، بیلوں کے متعلق؟

نواب سعادت کے بے تکے سوال نے شاذیہ کے غصے میں نفرت کا اضافہ بھی کر دیا۔ بولی:
ہاں مویشیوں کے متعلق پورا علم ہے۔ ایک مویشی تو آپ ہیں، چچا جان!''

''میں تمہارا سگا چچا''

''ہاں! پھوپھی بلقیس نے مجھے بتایا ہے کہ اگر میں نے ارشد سے شادی کر لی تو آپ میری رقم مجھے واپس نہیں کریں گے۔''

رقم؟ کیا تم نے مجھے کچھ اُدھار دے رکھا ہے؟

آپا بلقیس بھائی کی بدحواسی سے ابل رہی تھی۔ درمیان میں بول پڑی: ''شاذیہ کا مطلب وہ دس لاکھ روپے کی رقم ہے جو اس کے مرحوم باپ نے ترکے میں چھوڑی ہے اور تمہیں اس کا ولی نامزد کیا ہے، یہ رقم تمہارے قبضے میں ہے۔''

''جی ہاں!'' شاذیہ نے بات مکمل کی ''مگر صرف اس وقت تک کہ میں پچیس برس کی نہیں ہو جاتی۔''

''تو اب کیا عمر ہے تمہاری؟'' نواب سعادت نے پوچھا۔

''21 سال۔''

''تو پھر گلہ کس بات کا؟ چار سال بے فکری سے بڑی ہوتی رہو۔ تمہاری رقم بھی بنک میں اسی رفتار سے بڑھتی رہے گی۔''

شاذیہ اپنے چچا کی لاپروائی سے جسے اس نے اذیت کے طور پر محسوس کیا' کھول اٹھی اور کچھ نہ کر سکی تو پاس پڑے ہوئے ایک موہڑے کو ٹھڈا دے مارا۔ ظاہر ہے یہ حرکت ایک اچھے گھر کی لڑکی کو زیبا نہ تھی، تاہم یہ اس بات سے بدر جہا بہتر تھی کہ خود چچا کو ٹھڈا نکال مارتی اور یہی اصل اس کی دلی خواہش بھی تھی۔

آپا بلقیس کسی قدر سکون سے بولی: ''سعادت! میں نے شاذیہ کو بتایا ہے کہ ہم اسے سکندر سے شادی پر مجبور تو نہیں کر سکتے مگر ہم اس کی دولت کو تو کم از کم چار سال کے لئے محفوظ رکھ سکتے

ہیں۔اس نکھٹو مولوی زادے سے!''

''کون کہتا ہے ارشد نکھٹو ہے''؟ شاذیہ جوش سے بولی''اس کے پاس کافی رقم ہے۔۔
اگر میری وراثت مجھے ابھی مل جائے تو ارشد اسے ایک کمپنی میں ڈال کر ڈائریکٹر بن سکتا ہے۔''
بلقیس ناک چڑھا کر بولی۔''ایک نکما ملاّ زادہ اور ڈائریکٹر! اسے امریکہ جو بھیجا گیا تھا۔
کیا کما لایا ہے؟''

''پھوپھی! امریکہ تو وہ ٹریننگ کے لئے گیا تھا۔کمانے کا وقت تو اب ہے۔''

''شاذیہ بیگم؛ بحث کا کوئی فائدہ نہیں ارشد ناکارہ ہے ناکارہ۔''

اس پر شاذیہ فیصلہ کن انداز میں بولی؛''تو ٹھیک ہے میں بحث نہیں کروں گی۔ارشد ناکارہ ہے یا نکھٹو؛ تم دونوں بہن بھائی نوٹ کر لو کہ اس سے شادی کر کے رہوں گی خواہ چار سال ہمیں فاقے ہی کرنا پڑیں۔آئی سمجھ؟

پھوپھی کے دیدے اچھل کر باہر گرنے کو تھے چیخ کر بولی:''شاذیہ کیا سچ مچ تم......''
بلقیس غصے سے جملہ بھی پورا نہ کر سکی۔

پھوپھی بھتیجی کی باتوں میں نواب سعادت نے محسوس کیا کہ وہ بالکل فالتو پرزے کی طرح کھڑا ہے، چنانچہ دروازہ کھول کر باہر باغ میں نکل گیا۔باہر کی فضا میں جہاں نسوانی چیخیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔نواب سعادت نے سکون کا لمبا سانس لیا مگر چلتے چلتے جا نکلا تو اس جگہ جہاں اس کی پریشانی کا مرکز تھا یعنی رانی کے تھان کے قریب۔رانی ایک خوبصورت گائے تھی مگر دو روزہ فاقے نے اس کے حسن کو کملا دیا تھا۔رانی کو دیکھ کر نواب کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔زیرلب بولنے لگے ''رانی تو دو چار نوالے ہی کھا لیتی تو نمائش میں اول آ جاتی مگر اس حالت میں شاید تم تیسرا انعام بھی نہ لے سکو۔اب پہلا انعام ٹوانوں کی گائے لے جائے گی......اف میرے اللہ! یہ ذلت نا قابلِ برداشت ہو گی۔

اچانک پیچھے سے آواز آئی''نواب صاحب'' مڑ کر دیکھا تو نوجوان سکندر گھوڑے پر سے

اتر رہا تھا۔ یوں تو نواب صاحب اس وقت تنہائی چاہتے تھے لیکن یہ دیکھ کر کہ ان کے تخلیئے میں کسی عورت کی بجائے کوئی مرد مخل ہوا ہے، بہت ناخوش نہ ہوئے بلکہ یہ سوچ کر کہ سکندر بھی ایک بڑے زمیندار کا بیٹا ہونے کے ناتے سے شاید گائے بھینسوں میں دلچسپی رکھتا ہو اور رانی کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکے، خوش بھی ہوئے۔

پہلے سکندر بولا: ''جی میں حاضر ہوا تھا کہ اس افسوسناک واقعہ کے متعلق آپ سے بات کروں۔''

نواب سعادت: ''تمہاری ہمدردی کا شکریہ۔ مگر حالت خاصی مایوس کن ہے۔''

سکندر: ''جی ہاں میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ یہ اچانک ہو کیسے گیا۔''

نواب سعادت: ''میں خود حیران ہوں اور پریشان بھی۔''

سکندر: ''لیکن عجیب بات ہے پچھلے ہفتے وہ بالکل ٹھیک تھی۔''

نواب سعادت: ''بھئی وہ کل صبح تک ٹھیک تھی۔''

سکندر: ''جی ہاں: بالکل خوش و خرم۔''

نواب: ''بالکل''

سکندر: ''اور پھر اچانک حالات نے یہ افسوسناک پلٹا کھایا۔ خدا جانے یہ کیا معمہ ہے؟''

نواب: ''معمے کا تو حل نہیں مل رہا۔ ہم نے ہزار کوشش کی کہ کچھ کھالے مگر اسے بھوک ہی نہیں لگتی۔''

سکندر: ''شاذیہ کو بھوک نہیں لگتی؟ خدانخواستہ وہ بیمار تو نہیں؟''

نواب: ''شاذیہ؟ وہ ٹھیک ہے کم از کم چند منٹ پہلے تو چنگی بھلی تھی۔''

سکندر: ''تو چند منٹ پہلے آپ شاذیہ سے مل چکے ہیں؟ بھلا وہ اس افسوسناک معاملے کے متعلق بھی کچھ کہتی تھی؟''

سعادت: ''کچھ پیسوں کی بات کر رہی تھی۔''

سکندر: ''کس قدر انہونی بات ہوگئی ہے! افسوس۔''

نواب: ''بالکل انہونی۔ کبھی ایسا ہوا ہی نہ تھا۔ ماہرین مویشیاں کا کہنا ہے کہ اسے ہر روز پانچ کلو بھوسہ، پانچ کلو سبز چارا اور ایک کلو کھلی کھانا چاہئے۔''

سکندر: ''کیا کہہ رہے ہیں نواب صاحب؟ شاذیہ کو کھلی کھانا چاہئے؟''

نواب: ''شاذیہ کو؟ کیا ہوا ہے شاذیہ کو؟''...... حسبِ معمول نواب صاحب خواب سے بیدار ہوئے۔

سکندر: ''جناب میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ شاذیہ نے میرے ساتھ شادی سے انکار کیوں کردیا ہے؟''

نواب صاحب نے ماتھے پر انگلی رکھ کر سوچا جیسے کوئی بھولی بسری کہانی یاد کر رہے ہوں۔ پھر اچانک شاذیہ کی ملاقات یاد آئی اور بولے: ''وہ غالباً کسی دوسرے شخص سے محبت کرتی ہے اور ہاں سکندر بیٹے! سبز سرسوں کا استعمال کیسا رہے گا؟''

سکندر: ''سبز سرسوں کا استعمال؟ کس لئے؟ شاذیہ کو منانے کے لئے؟''

نواب: ''نہیں عزیز' رانی کو کھلانے کے لئے۔''

سکندر' نواب صاحب کی لایعنی گفتگو سے سٹپٹا گیا۔ ان پر ایک قہر کی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا: ''لعنت بھیجو رانی پر''...........اور یہ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا۔ نواب سعادت کو غصہ بھی آیا اور کچھ اطمینان بھی محسوس ہوا۔ غصہ اس بات پر کہ ایک رئیس زادہ ہو کر سکندر نے اتنی گندی زبان کیوں استعمال کی اور اطمینان اس بات پر کہ اس کی بھتیجی نے ایک ایسے شخص سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا جس کا گائے بھینسوں کا علم بالکل ناپختہ تھا۔ نواب صاحب اس خوشگوار خیال سے اپنے ذہن میں اجالا محسوس کر رہے تھے مگر آپا بلقیس کے اچانک ظہور سے ان کی آنکھوں کے سامنے پھر اندھیرا چھا گیا۔ آپ ایک خوش وضع خاتون تھی مگر جب کبھی غصے میں ہوتی' اس کے چہرے پر درندگی سی چھا جاتی اور نواب سعادت بچپن سے اس درندگی سے آشنا تھا۔ آپا کو غصے میں

دیکھ کر سعادت سہم گئے۔ آپا بولی:

''سعادت' اگر شاذیہ نے سکندر کے ساتھ منگنی توڑ دی تو میں زہر کھالوں گی۔ تم آج ہی کراچی جاؤ اور اس کم بخت ارشد سے ملو' وہ وہاں کس کمپنی میں کام کرتا ہے۔''

''مگر میں اسے جا کر کہوں گا کیا؟ میاں بیوی راضی کیا کرے گا قاضی۔''

''گولی مارو قاضی کو۔ تم اسے صرف اتنا بتا دینا کہ اگر اس نے شاذیہ کے ساتھ شادی کی تو چار سال تک شاذیہ کو اپنی رقم سے پیسہ تک نہیں ملے گا۔ بس تم یہ کہہ دینا اور پھر وہ خود بخود شاذیہ سے بھاگ کھڑا ہوگا۔''

نواب صاحب نے اپنا سر کھجایا اور انہیں یاد آیا کہ سکندر بھی جو تھوڑی دیر پہلے رانی پر تبرا کر کے رخصت ہوا تھا' ایسا اچھا رشتہ نہ تھا۔ چنانچہ ڈرتے ڈرتے بولے:

''آپا! شاذیہ' ارشد سے ہی شادی کر لے تو کیا حرج ہے؟''

''کیا حرج ہے؟'' آپا چلائی۔ ''حرج یہ ہے کہ ہماری بھتیجی...... ایک رئیس زادی...... نے ایک ملا کے لونڈے سے نکاح کر لیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

نواب سعادت نے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی دیا.......... ''مگر وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔''

''سعادت' تمہارے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے'' ۔ آپا بلقیس نے بھائی پر ایک غیض آلودہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''نوابوں کی بیٹی ایک معمولی آدمی کو چاہنے لگے، یہ نہیں ہوسکتا۔ بس تم آج دو بجے کی پرواز سے کراچی جانے کی تیاری کرو۔ وہ ملازادہ وہیں کہیں کام کرتا ہے۔''

''اچھی بات آپا۔'' نواب سعادت کپکپاتے ہونٹوں سے بولے ''اگر یہی تمہاری مم مرضی ہے۔''

اگلے روز سندھ کلب کراچی میں نواب سعادت نے ارشد کو دن کے کھانے پر مدعو کیا۔ اسے دیکھا تو وہ کچھ خوش نہ تھے۔ ارشد سے نہیں' اپنے مشن سے۔ ارشد بے شک ایک غریب مولوی کا لڑکا تھا لیکن تھا خوش شکل اور ذہین۔ امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاذیہ اسے چاہتی تھی اور وہ شاذیہ کو۔ مگر اب آپا کا حکم تھا کہ اس دوطرفہ چاہت کا

قلع قمع کر دوتا کہ شاذیہ سکندر کی طرف لوٹ آئے۔ جی ہاں، وہی بدتمیز سکندر جس نے نہ صرف پیاری رانی کے متعلق بدزبانی کی تھی بلکہ گائیوں پر من حیث النسل بھی لعنت بھیجی تھی...... نواب سعادت نے فیصلہ کرلیا کہ آیا خواہ کچھ کہے، کھانے کے دوران وہ ارشد کے ساتھ شاذیہ کی بجائے کسی دوسرے خوشگوار موضوع پر باتیں کریں گے اور پھر آپ نے ابتدائے کلام کی۔

''ارشد! تمہیں معلوم ہے ہمارا سعادت منزل کا باغ آج کل کس قدر جوبن پر ہے؟ میرا مالی یوں تو سادہ لوح آدمی ہے مگر گلاب کے پھول پیدا کرنے میں وہ بے شک فنکار ہے۔ تم پچھلی بہار میں وہاں گئے بھی تھے۔ کچھ یاد ہے وہ باغ؟''

''سر، میں نے تو وہ باغ حفظ کرلیا تھا۔ وہیں تو صبح صبح شاذیہ سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔''

نواب سعادت ذرا بدکے۔ وہ گفتگو کو شاذیہ سے ذرا فاصلے پر رکھنا چاہتے تھے، سو انہوں نے کوشش جاری رکھی اور بولے۔

''لیکن اس بہار میں تو گلاب کے تختوں کا حسن ہی نرالا ہے۔ ایک رنگ و بو کا طوفان ہے کہ پورے باغ پر چھایا ہوا ہے۔''

''سر سچی بات تو یہ ہے'' ارشد نے مؤدبانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''کہ گلاب کے پھولوں سے لطف اندوز ہونا اسی صورت میں ممکن ہے کہ ساتھ شاذیہ جیسی لڑکی ہو، سبز پتوں اور گلابی کلیوں کے پس منظر میں شاذیہ کے سنہری بال قوسِ قزح کا سماں پیدا کرتے ہیں۔''

''بے شک، بے شک'' نواب صاحب نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ''میں یہ سن کر بہت خوش ہوں کہ تمہیں گلاب کے پھول بہت پسند ہیں۔ اصل میں سعادت منزل کے باغوں کی زمین بھی گلاب کو بڑی راس آتی ہے اور پھر ہم کھاد کا بھی خاص اہتمام کرتے ہیں۔''

''نواب صاحب'' ارشد لمبے مضمون کو مختصر کرتے ہوئے بولا ''شاذیہ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اسے میرے ساتھ شادی کرنے سے منع کر دیا ہے۔''

نواب صاحب نے یہ سنا تو ان کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ جس نازک موضوع کو اپنی

دانست میں بڑی دانائی سے کسی موزوں موقع پر چھیڑنا چاہتے تھے' اس امریکہ کے تعلیم یافتہ لڑکے نے کسی لگی لپٹی بغیر چھیڑ دیا مگر اب جواب بہت دیر لٹکایا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ بولے:

''نوجوان: اب جب کہ تم نے یہ موضوع چھیڑ ہی دیا ہے تو بات یہ ہے کہ اس قسم کا ایک غیر رسمی فیصلہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دراصل میں تو نہیں' میری بڑی بہن اس معاملے میں......''

''جی ہاں'' ارشد بولا'' مجھے معلوم ہے ان کا خیال ہے میں فضول خرچ ہوں۔''

''نہیں صاحبزادے؛ جہاں تک مجھے یاد ہے: آپا محترمہ نے لفظ نکھٹو استعمال کیا تھا۔''

''جی ہاں'' ارشد نے اثبات میں سر ہلایا'' لیکن امریکہ جا کر میں نے ایک عظیم الشان زرعی فارم پر تربیت حاصل کی ہے۔ اس نے مجھے ایک نیا اعتماد اور ولولہ بخشا ہے...... میں اب ایک مختلف آدمی ہوں۔''

زرعی فارم کا نام سن کر نواب سعادت کی آنکھیں چمک اٹھیں اور توقع آمیز شوق سے بولا:

''عزیز: کیا سچ مچ تم نے فارم پر کام کیا ہے؟ وہاں تو جانور یعنی گائیں بھی ہوتی ہوں گی۔''

''جی ہاں' گائیں بھی۔''

نواب صاحب نے ہوا کا ایک بڑا گولہ نگلا۔ میز پوش کو مضبوطی سے پکڑا اور بولے:

'تو پھر شاید تم مجھے ایک مشورہ دے سکو۔ میری چیمپئن گائے رانی نے چارے کا مقاطعہ کر رکھا ہے اور کل نہیں تو پرسوں نمائش ہے۔ مجھے سخت تشویش ہے۔''

ارشد ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کرتے ہوئے ذرا گہری سوچ میں چلا گیا۔ اور پھر بولا:

''آپ کے گائے کی دیکھ بھال کرنے والے نوکر کی کیا رائے ہے؟''

''وہ دو روز سے جیل میں ہے۔''

''تو پھر ظاہر ہے' رانی اپنے رکھوالے کے غم میں نڈھال ہو رہی ہے۔'' ارشد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

نواب صاحب اس نئی تشخیص سے چونکے۔ وہ یہ بات سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی

انسان یا حیوان نورے جیسے گنوار سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ بولے: ''تو کیا رانی نورے پر اس قدر فدا ہے؟''

''جی ہاں؛ بلکہ نورے سے بھی زیادہ اس کی آواز پر۔ خصوصاً جب وہ صبح اور شام چارا ڈالنے سے پہلے رانی کو ایک میٹھے مترنم بول سے پکارتا تھا۔''

''سچ؟'' ارشد بولا ''رکھوالے کے بول اس کے پالتو جانور کے لئے بڑے اشتہا انگیز اور محبت خیز ہوتے ہیں۔''

''کتنی عجیب بات ہے!''

''مگر بالکل درست ہے نواب صاحب؛ یہ بات میں نے امریکہ میں فارم میں سیکھی۔ ہر جانور خصوصاً گائے کو اپنے رکھوالے کی مترنم پکار ملکہ ترنم کی غزل سے بھی زیادہ لبھاتی ہے۔ پھر گائیں فطرتاً جذباتی ہوتی ہیں۔ اگر یہ مانوس پکار ان کے کانوں میں نہ پڑے تو کھانا پینا بھول جاتی ہیں...... خواہ نمائش میں دو دن ہی باقی ہوں۔''

نواب صاحب نے تعجب اور تحیر میں ڈوبتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کر دیے اور کہا:

''اللہ، تیری کیا کیا حکمتیں ہیں!''

''جی ہاں!'' ارشد نے اپنا ماہرانہ تبصرہ جاری رکھا: ''دراصل ہر جانور ایک خاص آواز، ایک خاص بول پر، اور وہ بھی ایک خاص لے میں الاپا جائے تو بے حد خوش ہو کر چارا کھاتا ہے۔ مثلاً بکری کو مخاطب کرنا ہو تو چرواہے اکثر پہاڑی انگ میں پکارتے ہیں۔ ''او سوہنے من موہنے نی، چھیئے: چھیئے...... چھیئے'' اس پر بکری پیش کردہ چارے پر بے تحاشا ٹوٹ پڑتی ہے۔ اسی طرح بھیڑوں کے لئے الگ بول ہیں، حتیٰ کہ مرغیاں بھی ایک خاص آواز پر اپنے مالک کی ہتھیلی پر سے دانہ چگنے کو بھاگتی آتی ہیں۔ الغرض آپ کے ڈنر کی گھنٹی کی طرح ہر جانور کے ڈنر کے لئے ایک الگ پکار یا بول ہے۔''

''گائے کے لئے بھی؟ میرا مطلب ہے رانی کے لئے بھی؟'' نواب صاحب نے سہمے

سہمے پوچھا۔

''جی ہاں' رانی کے لئے بھی' ۔ یقیناً۔''

''اچھا!'' نواب صاحب کی باچھیں حدِ امکان سے بھی زیادہ کھل گئیں۔ بولے،'' بتا سکتے ہو عزیز بھلا رانی کس پکار پر چارا کھاتی ہے؟''

''نواب صاحب'' ارشد نے اپنی فلاسفی جاری رکھی'' یہ پکار ہر جانور اور اس کے رکھوالے کے درمیان ایک راز ہوتا ہے مگر خوش قسمتی دیکھئے کہ جب میں پچھلی دفعہ شاذیہ سے ملنے سعادت منزل گیا تو ہم ٹہلتے ٹہلتے رانی کے اصطبل کے قریب جا نکلے۔ ادھر سے نورا رانی کا چارا اٹھائے ایک پیاری سی لمبی لے میں اسے پکارتا آ رہا تھا۔

''ہو رانی' آ ؤ جانی' کھالو چارا...... آ ؤ جانی' کھالو چارا............''

اور یہ سنتے ہی رانی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ فوراً اٹھ کر نورے کی راہ تکنے لگی اور اس کے منہ سے رال بہنے لگی۔

نواب صاحب کرسی سے اچھل پڑے۔ بیتابی سے بولے:

''ذرا دہرانا اس پکار کو' بیٹا!''

ارشد:'' ہو رانی' آ ؤ جانی' کھالو چارا......''

اس پر نواب صاحب نے بھی پکار کر دہرایا لیکن وہ سر تال قائم نہ رکھ سکے جو ارشد کی ادائیگی میں تھی۔ ارشد نے نواب صاحب کو سمجھایا۔

''دیکھیں نواب صاحب! اس پکار کو تحت اللفظ پڑھنے سے گائے پر اثر نہ ہوگا۔ اسے اسی مالکونس کی سر میں گانا پڑے گا جس میں نورا گاتا تھا۔''

چنانچہ ارشد نے نمونے کے طور پر ایک مرتبہ پھر بول دہرایا۔

''ہو رانی' آ ؤ جانی' کھالو چارا......''

اس پر نواب صاحب نے گلا صاف کیا اور ترنم سے بول پر طبع آزمائی فرمائی۔ لیکن نواب

صاحب نے سُر کیا دہرائی۔ سارا ڈائننگ ہال سناٹے میں آ گیا اور تمام کھانے والوں کے ہاتھوں سے چھریاں کانٹے نیچے گر گئے۔

اتفاقاً نواب صاحب کے گلے سے سُر خاصی اونچی لے میں برآمد ہو گئی تھی' بلکہ ادائیگی کے دوران مالکونس بھی بے قابو ہونے لگی تھی۔ لیکن نواب صاحب سُر یاد کرنے میں اس قدر محو تھے کہ اگر ڈائننگ ہال کی چھت بھی ان پر آ گرتی تو وہ سر پر ہاتھ پھیر کر شہتیر ایک طرف کر دیتے اور پریکٹس جاری رکھتے۔ بہر حال ارشد نے نواب صاحب کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

''بہت خوب، بس تھوڑی سی مشق کی ضرورت ہے: لفظ 'ہو' کو دونوں دفعہ مدھم رکھیں۔ پہلی رانی کو مختصر کریں لیکن ''دوسری رانی'' کو کھینچیں اور اونچا لے جائیں۔ پھر آ'و' جانی سے آگے بتدریج مدھم سے کھرج کو چلتے جائیں جیسے سا سے نی تک سرگم جاتی ہے۔''

نواب صاحب، ارشد سے بہت مرعوب ہوئے مگر کہنے لگے' ذرا باہر چل کر تھوڑی سی مزید مشق کرا دو۔ میں تین بجے کی پرواز سے واپس جا کر آزماؤں گا۔''

نواب صاحب طیارے میں سوار ہوتے وقت بھی اس جادو بھری سُر کی مشق کرتے رہے لیکن پھر جیسا کہ ان کی عادت تھی' اڑنے کے بعد سو گئے۔ لاہور پہنچنے پر جاگے یا جگائے گئے تو کچھ دیر تو وہ حسب عادت سوچتے رہے کہ کہاں ہوں؟ کیوں ہوں؟۔ آہستہ آہستہ حافظہ بحال ہوا مگر جزوی طور پر۔ یہ تو یاد آ گیا کہ کراچی سے لاہور لوٹا ہوں' مگر وہ کیا تھا جسے گا کر گائے کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے.......... ایک لفظ تک حافظے میں باقی نہ تھا۔

گھر پہنچے تو آپا نے روئیدادِ سفر سننا چاہی اور سن چکیں تو اپنا ردِ عمل ایک چھوٹے سے پیارے سے جملے میں بیان کر دیا:

''سعادت، تم ایک عظیم الشان الو ہو۔''

''شکریہ آپا! عظیم الشان.......... آگے کیا کہا تھا؟''

''الو''

''الو؟''

''ہاں: اسے چغد بھی کہتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس ارشد لونڈے کو کلب میں کھانے پر بلا کر اتنی اہمیت دینے کی کیا تُک تھی؟ اور اگر بلا ہی لیا تھا تو پھر اسے صاف صاف کیوں نہ بتا دیا کہ شاذیہ کو چار سال تک اپنی جائیداد سے کچھ بھی نہیں ملے گا؟.......... امی ٹھیک کہا کرتی تھیں: تم ایک پیدائشی گھگھو ہو۔''

یہ کہہ کر آپا انتہائی مایوسی اور تلخی کے عالم میں اٹھ کر باہر چل دی۔ نواب سعادت کو تنہائی غنیمت محسوس ہوئی اور لگے حافظے پر زور دینے کہ کسی طرح گائے کو پکارنے کے الفاظ اور سُر یاد آجائیں، مگر کیسے یاد آتے؟ نواب صاحب کے دماغ کے اس گوشے میں جہاں حافظہ ہوتا ہے' دھند کے سوا کچھ نہ تھا۔ فقط ایک لفظ تھا جو اس دھند میں چکر لگا رہا تھا۔ ''رانی''۔ مگر اس ایک لفظ سے فائدہ؟ سارا راز تو پورے بول اور سُر میں تھا۔ نواب صاحب سخت بے چین تھے۔ ایک احمق کبھی معمولی بے چینی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ گھبرا کر اٹھے اور باہر باغ کا رخ کیا کہ شاید تازہ ہوا حافظے کو جھنجھوڑے۔ مگر باغ میں آئے' تو اس کے نیم تاریک گوشے میں انہیں ایک نسوانی ہیولی نظر آیا جسے نواب صاحب نے پہچان تو لیا مگر پہچان کر گھبرا گئے۔ نواب صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا اور شاذیہ کو اس مدھم روشنی میں دیکھ کر یوں محسوس کرتا جیسے باغ کے گوشے میں چاند اتر آیا ہو مگر نواب صاحب کا حوصلہ غروب ہو گیا۔ انہیں اپنی ذہین بھتیجی کا سامنا کرنے کی تاب نہ تھی...... جدید تعلیم نے لڑکیوں کو ایک ایسا بے باک طرزِ گفتگو بخش دیا ہے جس سے ان کی نانیاں دادیاں یکسر ناآشنا تھیں؛ چنانچہ انہیں اس شوخ بھتیجی سے ہم کلام ہونے کا شوق تو نہ تھا مگر اسے سامنے پا کر کچھ تو کہنا ہی تھا۔ بولے:

''شاذیہ' یہ تم ہو؟''

''ہاں میں ہوں۔''

''تم کھانے پر کیوں نہیں آئیں؟''

''بس نہیں آئی اور مجھے بھوک بھی نہیں تھی''

''یہی تکلیف میری گائے کو بھی ہے۔'' شاذیہ نے اپنے چچا کو ایک ایسی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جس کی کاٹ الفاظ سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ نواب صاحب نے کاٹ محسوس کی تو جھٹ پینترا بدلا...... بولے:

''ارشد کہتا تھا......''

شاذیہ نے ارشد کا نام سنتے ہی بات کاٹ کر کہا:

''کیا آپ ارشد سے ملے ہیں؟ کیا کہتا تھا؟''

''یہی تو مجھے یاد نہیں۔ لفظ رانی سے شروع ہوتا تھا۔''

شاذیہ نے ایک دفعہ پھر چچا کو گھورا اور کہا: ''میرا مطلب ہے آپ کی گائے کے ذکرِ خیر کے بعد کیا کہتا تھا۔ کیا اس نے یہاں آنے کے متعلق کچھ نہیں کہا؟''

''میرا خیال ہے کچھ کہا تو تھا۔''

''کیا؟''

''مجھے یاد نہیں۔''

شاذیہ نے غصے سے دانت بھینچ لئے۔ آنکھیں تنگ کر لیں اور پھر نواب صاحب کی سمت میں ایسی بے لفظ مگر با ملامت آواز نکالی کہ نواب صاحب بوکھلا اٹھے اور بولے:

''شاذیہ تمہیں بزرگوں کے سامنے ایسی آواز نہیں نکالنا چاہئے۔''

''ضرور نکالوں گی اور آپ بھی میرے ساتھ بزرگوں کی طرح نہیں بلکہ ایک گنڈار کی طرح پیش آ رہے ہیں۔''

''گنڈار کی طرح؟ گنڈار کیا ہوتا ہے؟''

گنڈار ایک کیڑا ہوتا ہے؟ پرلے درجے کا خود غرض اور کمینہ''

نواب سعادت کو محسوس ہوا کہ بھتیجی نے کوئی بے ادبی کر ڈالی ہے مگر کتنی شدید اس کا صحیح

اندازہ نہ تھا۔ بولے:

شاذیہ بیٹے! تم اندر جاؤ۔ یہاں سردی ہے، تمہیں زکام ہو جائے گا۔"

"ہونے دو۔ میں اندر نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں چاند دیکھوں گی اور ارشد کے متعلق سوچوں گی............ آخر آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"میں بھی کچھ سوچنے ہی آیا تھا' رانی کے متعلق۔ ارشد کا کہنا ہے کہ جب تک وہ صحیح پکار نہیں سنتی' وہ روزہ نہیں توڑے گی۔ ارشد نے مجھے پکار سکھائی بھی تھی لیکن مجھے بھول گئی ہے۔"

یہ سن کر شاذیہ بپھر گئی۔ بولی!

"تو کیا آپ ارشد سے گائے کو پکارنے کا سبق لیتے رہے ہیں؟ اس کی خواہش کو ٹھکرانے کے بعد اس سے سبق سیکھتے ہوئے شرم نہ آئی؟"

"لیکن......"

"چھوڑو لیکن کو" شاذیہ بے تابی سے بولی، "اگر ارشد کی سکھلائی ہوئی پکار سے آپ کی گائے رانی نے روزہ کھول دیا اور پھر بھی آپ نے ہم دونوں کی شادی کی اجازت نہ دی تو پھر اپنا نام نواب سعادت کی بجائے نواب بلا کو خان رکھ لینا۔"

"میری پیاری شاذیہ" نواب صاحب شاذیہ کی ساری گستاخیاں نظر انداز کرتے ہوئے بولے:

"اگر ارشد نے میری رانی کو چارا کھانے پر آمادہ کر لیا تو پھر تم دونوں کی منہ مانگی مراد پوری کروں گا۔

"ہوا وعدہ؟"

"دل و جان سے۔"

"اور پھوپھی بلقیس نے ٹانگ اڑائی تو؟"

"میں اس سے مشورہ ضرور لوں گا مگر کروں گا وہی کچھ جو خود چاہوں گا۔" یہ کہہ کر نواب

صاحب ذرا رکے اور کچھ یاد کر کے بولے۔

''وہ بول شروع تو لفظ رانی سے ہوتے تھے۔''

اتنے میں رات کی تاریکی میں ایک فاصلے سے کسی نوکر کے گانے کی آواز آئی.....''میرے جانی تری مہربانی' خدارا.....''

نواب سعادت کے کانوں میں اس آواز کا پڑنا تھا کہ وہ ہوا میں اچھل پڑے جیسے ان کے جسم کو بجلی نے چھولیا ہو۔ رانی کو پکارنے کے بول ان کے حافظہ سے نکل کر زبان پر آیا چاہتے تھے۔ نوکر اب نزدیک آگیا تھا۔ اس نے اپنے گیت کا مصرع ایک بار پھر دہرایا ''میرے جانی' تیری مہربانی' ملو خدارا۔''

معجزہ! نواب صاحب کو پکار کے سارے الفاظ یاد آگئے۔ ''ہو رانی.....آؤ جانی کھالو چارا.....''

گانے والا نوکر قریب آیا تو نواب صاحب نے پوچھا:

''کون ہو؟''

''جی میں ہوں روشن باورچی۔''

''شاباش روشن' تم نے بڑا کام کیا۔ آگے آؤ۔''

''حکم حضور۔''

''سنو!''

اور پھر نواب صاحب نے اپنی دانست میں پورے سُر تال سے پہلے بول گنگنایا اور پھر با قاعدہ پورے زور سے گایا۔ روشن باورچی کو جی کڑا کر کے داد دیئے بغیر چارہ نہ تھا۔ بولا:

''سبحان اللہ''

نواب صاحب نے ملازم کی داد کو خاص اہمیت نہ دی مگر بولے:''اب یہی بول تم گا کر دکھاؤ۔''

''میں؟'' روشن نے خاکسارانہ احتجاج کیا۔

''ہاں تم۔ یہ گائے کو کھانا کھلانے کا گانا ہے۔''

''لیکن حضور، میرا کام تو آپ کو کھانا کھلانا ہے۔''

شاذیہ رہ نہ سکی تو بولی:

''چچا! بے چارے روشن کو کیوں مجبور کر رہے ہو؟''

''اس لئے میری پیاری بھتیجی'' نواب صاحب اپنی تمام تر دانائی میں گویا ہوئے'' کہ ایک کی نسبت دو بہتر ہوتے ہیں۔ اگر میں کل سُر بھول گیا تو روشن تو یاد رکھے گا۔''

شاذیہ کو زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے چچا کی بات میں عقل کا شائبہ نظر آیا، چنانچہ روشن سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:

''ٹھیک ہے روشن' آؤ! ہم تینوں مل کر گائیں گے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ یہ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ سو' ذرا پھیپھڑے تان لو۔''

روشن اس ماہ پیکر نواب زادی کو' جسے پیار سے پیٹھ پر گھوڑا بن کر بٹھایا کرتا تھا' ٹال نہ سکا: چنانچہ وہ نوابوں کے لئے ڈنر گانگ بجانے والا مویشیوں کے لئے ڈنر گانا گانے پر راضی ہو گیا۔ لیکن نواب صاحب سے ایک درخواست کی۔

''حضور! اگر دوسرے نوکروں نے مجھے آپ کے ساتھ دوگانا گاتے ہوئے دیکھ لیا تو شاید سعادت منزل کے ڈسپلن میں کوئی فتور واقع ہو جائے۔ چلئے' چند قدم دور جا کر ریاض کرتے ہیں۔''

اس پر شاذیہ بولی: ''لیکن یہ گانا اگر ہم رانی کی خاطر گا رہے ہیں تو کیوں نہ اس کی کھرلی کے پاس جا کر گائیں تاکہ گانے کی تاثیر بھی دیکھ سکیں۔''

نواب سعادت کو شاذیہ کی تجویز میں ایک افلاطونی دانائی نظر آئی۔ کہنے لگے: ''شاذیہ' تم کس قدر زیرک ہو۔ کہاں سے پایا ہے تم نے یہ روشن دماغ''؟ ''ددھیال کی طرف سے تو یقیناً نہیں۔''

شاذیہ مختصراً بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے۔''

پھر تینوں رانی کے قریب پہنچے تو اس کی کھرلی میں تازہ سبز چارا یوں رکھا تھا جیسے ابھی کسی نے عشائیے کی میز پر کھانا چنا ہو اور مہمانوں کا انتظار ہو...... گویا رانی بدستور بھوک ہڑتال کئے بیٹھی تھی۔

''تو کہو' تیار ہو ساتھیو؟'' نواب صاحب نے روشن اور شاذیہ سے پوچھا۔

''جی ہاں'' دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

اس پر نواب صاحب نے سُر اٹھائی اور تینوں مل کر گانے لگے۔

''ہو رانی...... آ ؤ جانی' کھالو چارا......''

لیکن گانے میں نہ صرف آوازیں مختلف تھیں بلکہ سریں بھی اپنی اپنی تھیں۔ دنیائے نغمہ میں اس سے زیادہ افراتفری ناممکن تھی۔ نتیجہ یہ کہ باغ کے پرندے اپنے گھونسلوں سے راکٹوں کی طرح سوئے آسمان نکلے۔ یہاں تک کہ خود رانی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کے پاس کھڑے ہوئے مغنی طائفے کو گھورنے لگی۔ نواب صاحب کو رانی کا اٹھ کھڑا ہونا امید افزا شگون نظر آیا۔ ساتھیوں سے بولے: ''ایک بار پھر'' چنانچہ ایک بار نغماتی طوائف الملو کی ظہور میں آئی۔ پرندے ثریا کے قریب جا پہنچے لیکن رانی نے چارے کی سمت کوئی حرکت نہ کی۔ نواب صاحب پر ایک برفیلی مایوسی چھا گئی غصے میں بولے:

''اس ارشد کے بچے نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ دھوکہ دیا ہے......''

شاذیہ مساوی غصّے سے بولی: ''ارشد دھو کے باز نہیں۔''

''تو پھر ہمارا گانا بے اثر کیوں ہے؟'' نواب صاحب نے جواب طلب کیا۔

''اس لئے کہ صرف ایک دو ہی دفعہ تو ہم نے رانی کو پکارا ہے۔ شاید وہ ہماری دعوت پر غور کر رہی ہو۔ اگر ہم اپنی پکار کو ایک دفعہ پھر دہرائیں تو شاید وہ خوش ہو کر چرنے لگے۔''

''تمہارا مطلب ہے ایک دفعہ پھر گائیں؟'' نواب صاحب نے استفساراً کہا۔

''مطلب تو یہی ہے مگر صرف میں اور روشن گائیں گے۔ آپ کی آواز سے رانی الرجک ہے۔

اس دفعہ شاذیہ اور روشن نے لَے اٹھائی اور کہیں نغمے کے وسط میں تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''آہا! قوالی ہو رہی ہے' شاذیہ جی!''

''ارشد!'' شاذیہ خوشگوار حیرت سے چلّائی۔ ''تم یہاں؟''

''ہاں شاذیہ! تمہاری کشش کے آگے چارہ نہ تھا۔''

پھر نواب صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''السلام علیکم نواب صاحب!''

''وعلیکم السلام تم کب آئے ارشد؟''

''سر! آپ کے بعد دوسری پرواز سے ابھی ابھی پہنچا ہوں اور چند روز ٹھہروں گا بھی''

''وہ ٹھیک ہے مگر تمہاری سکھائی ہوئی پکار تو بالکل بے کار نکلی۔''

''جناب' آپ نے اسے ٹھیک لے میں نہیں گایا ہوگا۔''

''لے کیسے غلط ہو سکتی ہے؟ شاذیہ اور روشن نے بھی میرا ساتھ دیا تھا''

نواب سعادت نے اپنا گلا صاف کیا اور دایاں ہاتھ کان پر رکھ کر لے اٹھائی

''ہو رانی......''

''نہیں حضور!'' ارشد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ نے انترا کی استھائی بنا دی۔''

''معاف کرنا عزیز! میں اس معاملے میں بالکل کورا ہوں۔ اب تم بسم اللہ کرو۔''

''دیکھئے چچا جان'' شاذیہ ارشد کو کہنی سے ایک طرف کرتے ہوئے نواب صاحب سے ہم کلام ہوئی:

''ارشد رانی کو پکارے گا مگر ایک شرط پر۔''

''کون سی شرط بیٹی؟''

''یہی کہ اگر رانی چرنے لگی تو آپ ہمیں شادی کی اجازت دے دیں گے اور میری رقم بھی لوٹا دیں گے۔''

''یقیناً۔ اگر رانی راضی ہوگئی تو مجھے بھی راضی سمجھو۔''

اس پر ارشد ایک ماہر گائے پال کی طرح رانی سے ایک فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور پھر ایک

سریلی آواز میں ''ہورانی......'' کے پورے بول کو لہک لہک کر گایا۔ ارشد کی مترنم پکار سے رات گونج اٹھی اور ادھر گونج کی آخری لہریں رات کی خاموشی میں ڈوب ہی رہی تھیں کہ ادھر رانی کی کھرلی سے سبز پٹھے سمیٹنے' چبانے' ہڑپنے' ڈھکوسنے اور بھسکنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں' یوں جیسے پورے ایک ہزار پنجابی دیہاتی کسی ریستوران میں بیک وقت سوپ پینے لگیں۔ نواب صاحب نے یہ آوازیں سنیں تو خوشی سے ڈھیر ہو گئے۔

............رانی نے چرنا شروع کر دیا تھا۔

# بیگم کی گرامر

اتفاقاً میرے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا اور فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ بیگم نے تیر کی طرح الزام کھینچ مارا'' آپ ہمیشہ گلاس توڑ دیتے ہیں۔''

حالانکہ اس سے پہلے مجھ سے فقط ایک گلاس ٹوٹا تھا اور وہ بھی ہماری شادی کے ابتدائی دنوں میں یعنی آج سے کوئی پندرہ سال پہلے۔ کیا پندرہ سالوں میں کوئی واقعہ دو دفعہ ظہور پذیر ہو تو اسے ''ہمیشہ کہا جا سکتا ہے؟ لیکن زنانہ منطق کا اپنا ناپ تول ہوتا ہے' پھر یہ ہمیشگی کا الزام مجھ پر گلاس شکنی کے سلسلے میں ہی عائد نہیں کیا گیا۔ یہی فردِ جرم مجھ پر کئی دوسری' خاصی معصومانہ حرکات کے ضمن میں بھی لگ چکی ہے۔

'' آپ غسل خانے کا نلکا ہمیشہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں''...... حالانکہ یہ غلطی پندرہ سالوں میں شائد تین یا چار مرتبہ ہوئی ہوگی۔

'' آپ ہمیشہ الماری کی چابی گم کر دیتے ہیں''...... یہ جرم فقط ایک دفعہ سرزد ہوا تھا۔

'' آپ ہمیشہ کار میں پٹرول ڈلوانا بھول جاتے ہیں''...... یہ حادثہ ایک دفعہ بھی نہیں ہوا۔ محض پٹرول رک جانے پر بیگم صاحبہ کو شبہ ہوا کہ پٹرول ختم ہو گیا ہے۔

یہ تو ایسا ہی تھا کہ میں بچے کی پیدائش پر ماں بیٹے کو ہسپتال میں دیکھنے جاتا تو کہہ دیتیں:

''جائیے...... آپ تو ہمیشہ بچے ہی پیدا کرتے رہتے ہیں''...... حالانکہ سوال صرف ایک دفعہ اور ایک بچے کا تھا۔

لیکن نہیں، محترمہ ہمیشہ کا لفظ محض عادتاً استعمال نہیں کرتیں۔ ایسا ہوتا تو چند ایسے مواقع بھی ہیں جہاں یہ لفظ جائز طور پر استعمال ہو سکتا ہے اور استعمال کرنا چاہئے۔ مگر مجال ہے جو بیگم صاحبہ اسے نوکِ زبان پر لائیں...... مثلاً ہر مہینے پہلی تاریخ کو پوری تنخواہ بیگم کے حوالے کر دیتا ہوں لیکن آج تک اس شریف زادی کے منہ سے...... تعریف نہ سہی الزاماً ہی سہی...... یہ نہیں نکلا کہ آپ ہمیشہ تنخواہ لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ بلکہ اس ضمن میں کچھ فرماتی ہیں تو یہ کہ'' خدایا' کب مہینہ گزرے اور چند ٹکوں کا منہ دیکھنے کو ملے''

اسی طرح میرا معمول رہا ہے کہ بیگم کو ہر ہفتہ ایک نئی فلم دکھانے سینما لے جاتا ہوں، مگر مجال ہے جو اس ہمیشگی کا انہیں خیال تک آیا ہو۔ بلکہ الٹی شکایت کرتی ہیں:

''ہائے، فلم دیکھے پورا ہفتہ ہونے کو ہے''

خدا جانے اس موضوع پر اپنے مرغوب لفظ...... ہمیشہ...... کو کیسے پی جاتی ہیں!

اگلے روز ہم اسلام آباد میں ایک دوست کو ملنے گئے۔ اسلام آباد میں پہلی مرتبہ مکان آسانی سے نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ چنانچہ مکان تلاش کرتے ہوئے کچھ وقت گزر گیا تو بیگم صاحبہ نے حسبِ عادت فتویٰ دیا۔

''عجیب بات ہے۔ آپ ہمیشہ راستہ بھول جاتے ہیں۔''

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا:

''کیا کہا ہمیشہ؟''

''ہاں تو اور کیا؟''

''تو پیاری بیگم صاحبہ، مجھے یہ بتائیں کہ اس سے پہلے چار مرتبہ کہاں کہاں راستہ بھولا تھا؟''

''چار مرتبہ؟'' (لفظ چار پر زور)

''چلو ایک مرتبہ سہی۔''

''اب مجھے زبانی تھوڑا ہی یاد ہے۔''

''تو کیا کوئی تاریخ کی کتاب دیکھنا پڑے گی؟''

''ہاں یاد آیا پچھلے سال آپ مجھے سنار کی دکان کی بجائے سبزی فروش کی دکان پر لے گئے تھے۔ یاد ہے ناں؟''

''جی ہاں' بالکل یاد ہے۔ ہوا یہ تھا کہ آپ اپنے بُندے خریدنے کے لئے مجھے سنار کی دکان پر لے گئی تھیں۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سنار اپنی دکان کسی سبزی فروش کے ہاتھ بیچ کر مری روڈ پر چلا گیا ہے۔ لہٰذا قصور سنار کا تھا یا آپ کا، میرا کیسے ہوا؟''

''ارے جانے بھی دیں۔ آپ تو ہمیشہ بال کی کھال اتارتے رہتے ہیں۔''

لیجئے' پھر ہمیشہ! اور جہاں تک کھال اتارنے کا سوال ہے' خدا گواہ ہے کہ کھال اتارنے کی حرکت میں نے زندگی بھر نہیں کی۔ نہ بال کی اور نہ بکرے کی۔

اگلے روز ہمارا ڈائریکٹر ریٹائر ہوا تو دفتر والوں نے اسے الوداعی پارٹی دینے کا اہتمام کیا' یہ خالص مردانہ پارٹی تھی۔ میں نے بیگم کو کسی قدر معذرت آمیز لہجے میں بتایا کہ مجھے اس پارٹی میں اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ کہنے لگیں:

''ٹھیک ہے مگر آپ کا باہر جانا اور مجھے ہمیشہ اکیلے چھوڑ جانا اچھا نہیں لگتا''

''لیکن بیگم' میں نے احتجاجاً کہا:

''پچھلی دفعہ جب میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر باہر گیا تھا' کوئی دس سال پہلے کی بات ہے اور گیا بھی اس لئے تھا کہ بند ٹوٹ جانے کی وجہ سے آدھی رات کو تمام مردوں کو شہر بچانے کے لئے سیلاب کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ظاہر ہے اس تقریب میں آپ کی شرکت مناسب نہ ہوتی''

جواب میں ارشاد ہوا:

"آپ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں"

دیکھا آپ نے؟ پھر ہمیشہ! پھر بہانہ!

اگلے روز ڈرائنگ روم میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ اتفاقاً تھوڑی سی راکھ قالین پر گر گئی۔

بیگم نے جھٹ الزام تراشی کی:

"آپ ہمیشہ قالین پر راکھ جھاڑ دیتے ہیں"

میں نے کہا "کبھی کبھی راکھ گر جانے سے تو مجھے انکار نہیں لیکن اگر میں ہمیشہ اپنے چالیس سگریٹ روزانہ کی راکھ قالین پر جھاڑتا تو گزشتہ پندرہ سالوں میں اس ڈرائنگ روم میں 1,0950000=50×30×365×15 گرام یا تقریباً گیارہ ٹن راکھ کا ڈھیر لگ چکا ہوتا اور اس صورت میں یہ ڈرائنگ روم کی بجائے کوئلہ سینٹر نظر آتا"

لیکن بجائے اس کے کہ اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے کوئی معذرت کرتیں یا سیدھی سادی معافی مانگتیں، کہنے لگیں:

تو سچ مچ اتنی راکھ جمع ہو جاتی؟ پھر تو اچھا ہوا میں جوں توں کر کے ہر روز قالین صاف کرتی رہی"..... گویا محترمہ نے گیارہ ٹن فرضی راکھ ڈھونے کا کریڈٹ بھی اپنی جھولی میں ڈال لیا۔

چند روز ہوئے' دفتر بند ہوا تو میں گھر جانے کی نیت سے کار میں بیٹھا۔ مگر انجن نے جواب دے دیا۔ ناچار کار کو دفتر ہی میں چھوڑا اور بس سے گھر روانہ ہوا۔ بس سٹاپ سے گھر پہنچا لیکن جونہی اندر قدم رکھا' بیگم چلائی۔

"آپ ہمیشہ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے جوتے پہنے ڈرائنگ روم میں داخل ہو جاتے ہیں"

یہ میری پیٹھ پر آخری تنکا تھا۔ میں نے اسی لمحہ ایک فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کی رُو سے اب

1۔ ہمیشہ اپنا سگریٹ قالین پر جھاڑتا ہوں.....اور بیگم صاحبہ کو سچ مچ یہ راکھ چننا پڑتی ہے۔ جس سے انہیں درد کمر کی مستقل شکایت ہے۔

2۔ غسل خانے کا نلکا ہر روز کھلا چھوڑتا ہوں ..... اور بیگم اسے بھاگم بھاگ بند کرتی رہتی ہیں۔

3۔ جب بھی بیگم میرے ساتھ کار میں نکلتی ہیں، میں ہمیشہ غلط رستے پر ہو لیتا ہوں۔ بیگم چلاتی رہتی ہیں کہ "یہ ہے صحیح رستہ ادھر مڑیئے" آخر مڑتا تو ہوں لیکن بیگم صاحبہ کو ذرا تڑپا کر!

4۔ ہر روز عارضی طور پر چابیاں گم کر دیتا ہوں تا کہ بیگم صاحبہ تھوڑی دیر کے لئے شپٹا ئیں اور شپٹاتی رہیں۔

5۔ جہاں کہیں کیچڑ ملے، جوتوں پر مل کر ڈرائینگ روم میں آ جاتا ہوں...... بیگم پاؤں پڑتی ہیں کہ خدارا ایسا نہ کیجئے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے لطف اٹھاتا ہوں۔

الغرض اب بیگم نے ان "ہمیشہ" والے الزامی جملوں کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اب ان کا مرغوب فقرہ ہے" آپ پہلے تو ایسا نہیں کرتے تھے۔ میرے چاند! اس پر بھی میں تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے لطف اٹھاتا ہوں...... ویسے میں یہ حرکتیں کرنا چھوڑ تو دوں گا لیکن ابھی نہیں تا کہ یہ سبق بیگم صاحبہ کو اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے کہ ایک یا دو کو "ہمیشہ" کہنا درست نہیں نہ حقیقت کے طور پر اور نہ گرامر کی رو سے

آخری خبر یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کی گرامر بڑی تیزی سے سدھر رہی ہے۔

# وے اُفتاد مشکلہا

ہم چند دوست پنڈی کلب کے سبزہ زار میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ کلب کے سیکرٹری کرنل اوپل ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔قریب پہنچے تو ایک کتاب دکھاتے ہوئے کہنے لگے۔

''دیوان غالب کا چغتائی ایڈیشن ہے' کوئی خریدار ہے؟''

''ہماری ٹولی کے سرغنہ ڈاکٹر مجید ہنس کر بولے

''سیکرٹری صاحب' کتاب فروشی کب سے شروع کی ہے؟''

کرنل اوپل بولے'' یہ کتاب میری نہیں' رانا مختار کی ہے؟''

رانا کا نام سن کر ہم سب نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا حیرت دو باتوں پر تھی ایک تو یہ کہ رانا صاحب جیسا بیگانۂ شعر وادب دیوانِ غالب تک کیسے پہنچا اور اگر غیر حاضر دماغی کے کسی ریلے میں اس نے یہ کتاب خرید ہی لی تھی تو وہ کون سی افتاد آپڑی تھی کہ اب اسے بیچنے کی نوبت آگئی۔کلب کے سارے ممبر جانتے تھے کہ رانا ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔نوجوان تھا اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھا۔ڈاکٹر مجید نے ازراہِ تفنن پوچھا:

''رانا بہادر کہیں چپکے چپکے دیوالیہ تو نہیں ہو گئے۔؟''

---

"The Trouble Down at Tudsleigh" By P.G wodehouse

کرنل اوپل بولے: ''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔ رانا نے دیوانِ غالب ایک خاص مقصد کے لئے خریدا تھا مگر اب اسے اس کی مزید ضرورت نہیں۔''

''کون سا مقصد تھا؟'' میجر چوہدری نے پوچھا۔

''بھئی بڑا نیک مقصد تھا۔ رانا دیوانِ غالب کی معرفت ایک لڑکی کی نظروں میں سمانا چاہتا تھا۔''

''کون سی لڑکی''؟ ہم سب نے تقریباً یک زبان ہو کر پوچھا۔

''آپ اسے نہیں جانتے'' کرنل اوپل نے کہا اس کا نام نفیسہ شہباز ہے اور وہ جہلم میں رہتی ہے۔ پچھلے دنوں رانا وہاں چند روز کے لئے مرغابی کے شکار کے لئے گیا تھا جانے سے پہلے وہ اپنے چچا خان بہادر رانا بشیر حسین خان سے ملنے گیا تو انہوں نے ہدایت کی کہ بیٹا' جہلم جا رہے ہو تو وہاں میرے مرحوم دوست نواب شہباز خان کی بیوہ سے ضرور ملنا۔ انہیں میرا اسلام کہنا' بس یوں سمجھنا کہ بیگم شہباز تمہاری چچی لگتی ہیں۔ اور ہاں' شہباز منزل دریا کے کنارے سب سے عالی شان مکان ہے اسے ڈھونڈھنے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہو گی۔

چنانچہ رانا جہلم پہنچا۔ ہوٹل فردوس میں ڈیرے ڈالے اور سرِ شام ہی شہباز منزل کو روانہ ہوا کہ چچا کے حکم کی تعمیل سے پہلے روز ہی فارغ ہو لے۔ ابھی شہباز منزل کے بیرونی باغیچے سے ہی گزر رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں ایک میٹھی سی زنانہ آواز کی بوندیں ٹپکیں: یکسر کوثر و تسنیم کی بوندیں۔ اس پر اس نے دائیں طرف جو کان لگائے تو یوں لگا جیسے گلاب کے پودوں کی اوٹ میں کوئی لڑکی' کسی اجنبی کی موجودگی سے بے خبر ترنم سے شعر پڑھ رہی ہے۔ رانا کے دل میں اس مغنیہ کو دیکھنے کی بے پناہ خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے راہ چھوڑ کر دو چار قدم دائیں جانب اٹھائے اور پھر چند گز کے فاصلے پر نگاہ ایک ایسی حسینہ پر پڑی کہ

غارت گرِ تحمل و ایماں کہیں جسے

رانا نے اس کی ایک جھلک ہی دیکھی اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ آواز تو اس غیرتِ

ناہید کی تھی ہی دیپک' غریب رانا اس کے شعلے کی لپک میں بھی آ گیا۔ لڑکی کیا تھی! قدورخ کا فتنہ دوراں! جوش کی جنگل کی شہزادی کی طرح:

کافر ادا ' شگفتہ ' گل پیرہن ' سمن بو
سروچمن ' سہی قد ' رنگین جمال ' خوش رو

رانا کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ شہباز منزل میں ایک ایسے انمول ہیرے سے بھی مڈبھیڑ ہوگی۔ چنانچہ وہیں کھڑے کھڑے سب سے پہلے تو اس نے اپنے مرغابی کے پندرہ روزہ شکار کے پروگرام میں ترمیم کی یعنی اسے سرے سے ترک کر دیا اور اسی لمحہ ایک نیا پروگرام ترتیب دیا۔ جس کی رو سے اگلے پندرہ روز کے لئے شہباز منزل میں کان کنی کا فیصلہ کیا کہ شاید کوئی ہیرا ہاتھ لگ جائے۔

رانا کو لڑکی کی پہلی دید کے سحر سے آزاد ہونے میں ذرا وقت لگا مگر جونہی اس کے حواس بحال ہوئے اس نے دیکھا کہ لڑکی اکیلی نہیں بلکہ اس کے پاس ایک دس سالہ بچی بیٹھی ہے جسے وہ کتاب سے شعر پڑھ کر یا گا کر سنا رہی تھی۔ معارانا کے ذہن میں خیال آیا کہ کاش اس کتاب کا نام معلوم ہو سکے۔ دوسرے عاشقوں کی طرح رانا بھی اس فلسفے کا قائل تھا کہ محبوبہ کے دل تک پہنچنے کا سہل ترین رستہ اس کی پسندیدہ چیز سے محبت کرنے میں ہے۔ اور اگر یہ پسندیدہ چیز کوئی کتاب ہے تو دل تک ایک شارٹ کٹ مل سکتا ہے بس اس کتاب کی چند سطور یا اشعار یاد کر لو اور انہیں محبوبہ کے سامنے موقع بے موقع جھوم جھوم کر دہراتے رہو' گنگناتے رہو' گاتے رہو' پھر کوئی وجہ نہیں کہ محبوبہ آپ کو اپنا ہم خیال' ہم نوا بلکہ ہمدم نہ سمجھنے لگے اور پھر اس مقام سے شادی دو قدم ہے یعنی جتنا شبانی سے کلیمی تک کا فاصلہ ہے۔

اور عین اسی لمحے رانا کی قسمت نے یاوری کی۔ لڑکی' جیسا کہ جوان لڑکیوں کا دستور ہوتا ہے' ایک شعر سے اس قدر مسحور ہوئی کہ کتاب بند کر کے گود میں رکھ دی اور نیم واخوابگوں آنکھوں سے آسمان کی نیلگوں وسعتوں کو دیکھنے لگی اور شعر کی کیفیت میں کھوگئی لڑکی پر یہ بے خودی کا عالم

طاری تھا تو رانا کو کتاب کا نام پڑھنے کا موقع مل گیا۔ دور سے ہی نظر آیا' دیوانِ غالب' بس نام معلوم ہو گیا تو رانا دبے پاؤں لوٹا اور ہوٹل میں پہنچ کر لاہور کے ایک کتاب فروش کو فون کیا کہ دیوانِ غالب کا ایک بہترین نسخہ فی الفور بھیجو۔ کتب فروش نے وعدہ کیا کہ کل نہیں تو انشاء اللہ پرسوں مرقعِ چغتائی آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

لیکن دیوانِ غالب کے آنے تک جنونِ عشق نے رانا کو فارغ نہ بیٹھنے دیا، چنانچہ شام پھر شہباز منزل کے طواف کو نکلا اور اب کے اپنے چچا کے سلام کے ساتھ بیگم شہباز کے دیوان خانے میں حاضری دی۔ وہیں وہ غالب نواز لڑکی بھی بیٹھی تھی بیگم شہباز نے اسے بیٹی کہہ کر اور نفیسہ پکار کر رانا سے تعارف کرایا اور ساتھ ہی اس سبز آنکھوں والی دس سالہ بچی سے بھی جو نفیسہ کی چھوٹی بہن تھی اور جس کا نام فرحت تھا مگر بلاتے فری تھے...... یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن رانا ابھی نفیسہ پر اپنی محبت بھری نگاہیں مرکوز کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا' مضبوط کاٹھ کا خوبرو جوان کمرے میں داخل ہوا۔ جسے دیکھ کر فری کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ نکلے جیسے کہہ رہی ہو '' کیپٹن خار آ گئے۔''

'' وہ کیپٹن خار تھے یا کیپٹن گل' رانا کے لئے ان کی آمد نہایت ناموافق شگون تھا کیونکہ ایک بات واضح تھی' رانا، نفیسہ کا واحد امیدوار نہیں تھا اور یہ بھی کہ مخالف امیدوار جو ایک خوبصورت لارنس پور کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور آتے ہی نفیسہ کے پہلو میں کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگا تھا' خاصا جاندار رقیب تھا''

بیگم شہباز نے دونوں جوانوں کا تعارف کرایا۔'' کیپٹن افتخار۔ رانا مختار' کپٹن افتخار آرمرڈ کور میں افسر ہیں' آج کل چھٹی پر ہیں اور یہاں سے کوئی دو میل اوپر دریا کے کنارے ایک کوٹھی میں قیام پذیر ہیں۔''

رانا کے منہ سے روایتی کلمہ نکلا'' آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' لیکن یوں لگا جیسے خوشی کا لفظ بھینچے ہوئے دانتوں سے نکلنے کے عمل میں بالکل مضمحل ہو گیا ہو۔ بیگم شہباز نے تعارف

جاری رکھا:

''رانا مختار ہمارے خاندانی دوست خان بہادر رانا بشیر خان کے بھتیجے ہیں۔''

مگر اس کے جواب میں کیپٹن افتخار کے منہ سے روایتی کلمے کی بجائے فقط ایک پیچیدہ سی جماہی وارد ہوئی اور روایتی خوشی ..... اگرچہ کچھ کہیں تھی ..... ہوا بن کر خارج ہوگئی۔ ظاہر تھا کہ کیپٹن افتخار اس تعارف سے کچھ محظوظ نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے نزدیک اگر دنیا معقول آدمیوں کے رہنے کی جگہ تھی تو اس میں رانا جیسے لوگوں کی ایک قلیل سی اقلیت بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ ادھر رانا کی نگاہ میں اگر شہباز منزل کو کسی آلائش سے پاک ہونا چاہئے تھا تو وہ اس سرخ وسپید ترشیدہ مونچھوں اور بھوری آنکھوں والے کپتان کا وجود تھا۔

بہرحال رانا جلد ہی سنبھل گیا اس نے دل کو سمجھایا' ایک دفعہ دیوانِ غالب آ لینے دو پھر اس احمق فوجی کو قدرِ عافیت معلوم ہوگی۔ آخر سرخ وسپید چہرہ' ترشیدہ مونچھیں اور بھوری آنکھیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ نفیسہ جیسی نفیس طبع لڑکی کو جیتنے کیلئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ' وہ' روح ہے!'' اور رانا کو یقین تھا کہ دیوانِ غالب کے آتے ہی اس کے اندر ایک توانا روح پھنک جائے گی، چنانچہ اس نے کیپٹن افتخار کی موجودگی کے باوجود پارٹی میں خوب ڈوب کر حصہ لیا اور ایک دو دفعہ تو نفیسہ کو بھی داد دیتے ہی بنی۔ یہ نوازش ہائے بیجا دیکھ کر کیپٹن تو اہلنے لگا، چنانچہ جونہی پارٹی ختم ہوئی' کیپٹن افتخار رانا کو ایک طرف لے گیا اور اسے کہنے لگا'

''سنو' رانا نگر ینہ.....''

''میرا نام رانا مختار ہے۔''

''چلو' رانا جو کچھ بھی ہو' جہلم میں کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟''

''ارادہ تو خاصے لمبے قیام کا ہے۔''

''میرا مشورہ یہ ہے کہ اس ارادے کو ترک کردو۔''

''کیوں؟''

''تمہاری صحت کے لئے مفید ہوگا۔''

''لیکن مجھے تو جہلم کے نظارے پسند ہیں۔''

''لیکن اگر تمہاری دونوں آنکھیں گل کر دی گئیں تو نظارے کیسے دیکھو گے۔''

''لیکن میری آنکھیں گل کیسے ہو جائیں گی؟''

''بہت سے طریقے ہیں آنکھیں گل کرنے کے۔''

''لیکن گل کرے گا کون؟''

''یہ تو تفصیل میں جانے والی بات ہے ویسے حادثات تو ہوتے ہی رہتے ہیں اچھا تو شب بخیر۔''

یہ کہہ کر کیپٹن افتخار اپنی دو سیٹوں والی سرخ کار میں لپک کر بیٹھ گیا اور یوں لگا جیسے اس کے وزن کے نیچے کار کے منہ سے آہ نکل گئی ہو۔ کیپٹن بڑے مضبوط اور توانا جثے کا آدمی تھا۔ رانا نے کیپٹن افتخار کے حدود اربعہ کا جائزہ لیا اور ایک گہرا سانس لے کر اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس بات سے انکار مشکل ہے کہ کیپٹن افتخار کی باتوں نے رانا کو..... ایک انگریزی محاورے کے مطابق..... سوچ بچار کے لئے کافی خوراک مہیا کر دی تھی۔ چنانچہ رات کو سونے سے پہلے اور صبح جاگنے کے بعد رانا اسی خوراک کی جگالی کرتا رہا۔ رانا خاصا زیرک اور ہوشیار جوان تھا اور کیپٹن کی نیت کا اسے صحیح اندازہ تھا کیونکہ اس کی نیت ایسی غیر واضح بھی نہ تھی، چنانچہ اب رانا کے لئے سوال یہ تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ رانا نے زندگی میں اس سے پہلے بھی عشق کئے تھے لیکن ایسی پُر خطر صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بس وہ ہوتا تھا اور متعلقہ محبوبہ' جتنی دیر معاشقہ چلتا رہتا چلنے دیتا اور جہاں رکنے لگتا' کسی دوسرے در پر صدا جا لگاتا، مگر یہ پہلی بار تھی کہ محبوبہ سے پہلے رقیب سے ٹکر ہو رہی تھی اور خاصے خوفناک رقیب سے۔

لیکن پھر ایک واقعہ نے حالات بدل کر رکھ دیئے: دیوانِ غالب کا پارسل آ گیا۔ اور ہر چند کہ رانا کے مرزا غالب سے پہلے سے کسی قسم کے مراسم نہ تھے۔ تاہم وہ پارسل کھولتے ہی دیوان

لے کر بیٹھ گیا اور بسم اللہ کر کے پہلی غزل پڑھنے اور یاد کرنے لگا۔

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غزل کے پانچ شعر ہیں جنہیں ایک عام آدمی کے لئے صحیح طور پر پڑھنا اور یاد کر لینا آسان کام نہیں لیکن شوق ہو تو انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ شام کو شہباز منزل جانے سے پہلے رانا نے پوری غزل حفظ کر لی تھی اور اپنی صوابدید کے مطابق اشعار کو کچھ معنی بھی بخش دیئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان مطالب کا غالب کے منشا سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا بلکہ اگر غالب انہیں سن پاتے تو قبر پھاڑ کر کہتے'' رانا میاں خدا کا خوف کرو۔ میرے اشعار سے یہ سلوک؟''

لیکن شاید رانا کی حالتِ زار دیکھ کر نظریۂ ضرورت کے تحت' اسے یہ کہہ کر معاف بھی کر دیتے کہ:

سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

بہر حال رانا دیوانِ غالب کے چغتائی ایڈیشن سے مسلح ہو کر اور پہلی غزل رٹ لینے کے بعد جب شہباز منزل پہنچا تو اس کا مورال خاصا بلند تھا اور جب اس نے دیوان خانے میں قدم رکھا تو ذرا اس کی خوشی اور خوش قسمتی کا اندازہ کریں کہ نفیسہ تو موجود تھی مگر کیپٹن افتخار غائب تھا۔ فوجی رقیبوں کا ایک فائدہ ہوتا ہے، بعض اوقات انہیں چھٹی سے بھی ڈیوٹی کے لئے بلا لیا جاتا ہے چنانچہ کیپٹن افتخار کی عدم موجودگی نے رانا کی خود اعتمادی پر بڑا مثبت اثر کیا اور وہ بڑے مزے سے چائے پینے اور باتیں کرنے لگا لیکن دل ہی دل میں رانا اب اس لمحے کی تاک میں تھا کہ کسی کے منہ سے کوئی ادبی یا شاعرانہ بات نکلے اور اسے اپنی غالب دانی کی نمائش لگانے کا موقع مل جائے غالب کی پہلی غزل تو اس کی نوکِ زبان پر تھی۔

اور وہ لمحہ جلد ہی آ گیا۔ بیگم شہباز اچانک اٹھ کھڑی ہوئیں اور نفیسہ سے کہنے لگیں:

'' مجھے تمہارے چچا کو خط لکھنا ہے کوئی تمہارا پیغام بھی ہے؟''

نفیسہ بولی: پیغام تو کوئی خاص نہیں چچا کے ساتھ پک نک کی چند تصاویر ہیں جنہیں دیکھ کر وہ شاید خوش ہوں گے۔''

ساتھ ہی نفیسہ نے اپنے پرس سے ایک ایک کر کے چند تصاویر دیکھنے کی دعوت دی۔

رانا جھٹ بولا: کہاں ہوتے چچا غالب' تصویریں دیکھتے تو کہتے:

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نفیسہ نے رانا کے منہ سے غالب کا کلام سنا تو اس کے منہ کو دیکھتے ہی رہ گئی اور حیرت کے عالم میں اس کے ہاتھ سے پرس گر پڑا۔ بولی:

''کیا آپ سچ مچ غالب پڑھا کرتے ہیں؟''

رانا کو اپنی غالب دانی کی نمائش کا موقع مل گیا۔ بولا:

''میں؟ غالب؟ پڑھا کرتا ہوں؟ اخ' اخ' محترمہ یہ پوچھیں کہ غالب پڑھنے کے علاوہ میری زندگی کی اور کوئی دلچسپی بھی ہے؟ مجھے غالب سے عشق ہے۔''

''مجھے بھی'' نفیسہ فرطِ شوق سے بولی'

''کیا الہامی کلام ہے غالب کا''

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

''جی ہاں' بالکل الہامی۔'' رانا نے تائید کی'' اور مثلاً'' پہلی غزل کا ہی یہ شعر'

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

''سبحان اللہ'' نفیسہ نے داد دی'' اور پھر وہ غیر فانی غزل جس کا مطلع ہے:

کہتے ہو نہ دیں گے دل' ہم نے گر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

''جی ہاں، بالکل غیر فانی'' رانا نے نفیسہ کی تائید کی۔''اور ہے نا عجب اتفاق کہ تمہیں بھی سب شاعروں میں سے غالب ہی پسند ہے۔''

''پسند بہت کمزور لفظ ہے، مسٹر رانا'' نفیسہ نے احتجاج کیا''میں تو غالب کی پجارن ہوں۔''

رانا بولا''لیکن حد ہے کہ کچھ آدمی غالب کو مہمل گو کہتے ہیں۔''

''احمق کہیں کے، چاند پر تھوکتے ہیں۔'' نفیسہ نے حرفِ آخر کہہ دیا۔''ہمارا تو پیر و مرشد ہے غالب''

''اور میرا بھی'' رانا نے تائید کی۔''جو شاعر نقش فریادی جیسا مصرع لکھ سکتا ہے اسے پیر و مرشد نہ مانیں تو کیا مانیں؟''

اس مقام پر نفیسہ اور رانا نے ایک دوسرے کو جذباتی ہم آہنگی کے عالم میں دیکھا نفیسہ بولی:''لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ بھی غالب کے اتنے ہی دلدادہ ہوں گے جتنی میں۔''

''کیوں؟''

''بس میں سمجھتی تھی کہ آپ ذرا کھلنڈری طبیعت کے نوجوان ہیں۔''

''کیا کہا' کھلنڈری طبیعت؟ میری؟ بھئی اتنا غضب تو نہ کرو۔ مس نفیسہ' میرے نزدیک تو وقت کا بہترین مصرف بس اتنا ہے' کہ گوشۂ چمن ہو یا ساحلِ دریا ہو' میرے ہاتھ میں دیوانِ غالب ہو۔''

اس ماحول میں نفیسہ پر بھی کلامِ غالب' غالب آ رہا تھا، بولی:

آپ کو غالب کی وہ غزل پسند ہے جس کا مطلع ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت' درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

''بے حد پسند ہے'' رانا نے معنی سمجھے بغیر کہا''اور کیا خیال ہے تمہارا اس مصرعہ کے متعلق!

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

رانا نے پورے شعر کی بجائے صرف ایک مصرعہ قصداً پڑھا تھا۔ اسے فکر لاحق ہو رہی تھی کہ اس کی غالب دانی کا ذخیرہ جو پہلی غزل تک محدود تھا' کہیں ختم نہ ہو جائے۔

نفیسہ بولی' ''بڑا پیارا مصرعہ ہے' مگر یاد ہے تمہیں غالب کی وہ روح پرور غزل''

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

''جی ہاں' بالکل روح افزا ہے'' رانا نے اپنی دانست میں بڑی شاعرانہ داد دی اب کلام غالب کا اگلا نمونہ پیش کرنا رانا کی باری تھی اسی کفایت شعاری کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے کاوکاو والے شعر کا دوسرا مصرعہ پیش کیا اور کہا: ''ذرا یہ بھی سنیے:''

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

نفیسہ بولی' ''آپ کس قدر متوالے ہیں غالب کی پہلی غزل کے؟''

''متوالا تو ہوں'' رانا نے اقرار کیا۔

''میرا بھی یہی حال ہے'' نفیسہ بولی'' یہ دریا جو ہمارے گھر کے ساتھ بہتا ہے' مجھے ہمیشہ جوئے شیر والا مصرعہ یاد دلاتا ہے''

رانا جھٹ بولا'' ارے میں بھی حیران ہو رہا تھا کہ یہ پہلی غزل ہی میرے شعور میں کیوں ابھر کر آئی ہے تو یہ آپ کے دریا کے نظارے کا اثر ہے اور ہاں دریا سے یاد آیا اگر کوئی مصروفیت نہ ہو تو کل تھوڑی سی کشتی رانی کیوں نہ کریں؟''

''کل؟''

''ہاں کل میرا خیال تھا کشتی میں کچھ کھانا کچھ مشروبات اور دیوانِ غالب رکھ لیں گے''

بڑا اچھا خیال ہے لیکن کل صبح تو میں نے کیپٹن افتخار کے ساتھ شاپنگ کے لئے جانے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اگرچہ دوسرے وقت میں بوٹنگ بھی ہو سکتی ہے۔

''یہ بھی اچھا خیال ہے''

''چلیں' کل ایک بجے بعد دوپہر کشتی رانی کریں گے۔''

''یہ بہت ہی نیک خیال ہے۔ایک بجے بعد دوپہر میں پُل کے پاس پہنچ جاؤں گا اور کشتی کا انتظام کر رکھوں گا۔''

''میں بھنا ہوا مرغ اور کچھ سینڈوچ لے آؤں گی۔''

''میں تو مرقعِ چغتائی لاؤں گا ہی

تو پھر کل ایک بجے پُل کے نیچے۔

''انشاءاللہ''

رانا شہباز منزل سے نکلا تو پیدل نہیں چل رہا تھا اڑ رہا تھا۔اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنہری رنگت آ گئی تھی اور جدھر دیکھتا تھا اسے فضا دھنک رنگ لگ رہی تھی لیکن جب رات کو ہوٹل کے سبزہ زار میں بیٹھا سگریٹ کے کشوں کے درمیان آنے والے کل کے تصورات میں گم تھا تو اسے ایک سایہ قریب آتا دکھائی دیا اور آنکھ اٹھا کر جو دیکھا تو بوجھیں بھلا کون تھا؟ کیپٹن افتخار! اسے دیکھ کر رانا کا آدھا رومان سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ پریشان ہو گیا۔

''السلام علیکم' رانا نگرینہ'' افتخار نے ابتدا کی۔

''میرا نام رانا مختار ہے۔''

''یعنی رانا جو کچھ بھی ہے' میں نے سلام کہا ہے۔''

''وعلیکم السلام''

کیپٹن افتخار کی زبان پر تو سلام تھا' لیکن اس کی تیز چیرتی نگاہوں' پھنکارتی سانسوں اور مضبوط تنے بازوؤں میں سلامتی کا کوئی پیغام نہ تھا۔رانا کو محسوس ہوا کہ کسی لمحے اس شخص کے منہ سے دہکتا ہوا لاوا بہنے لگے گا۔بہرحال رانا نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذرا مسکرا کر کہا:

''ہیلو کیپٹن''

لیکن کیپٹن افتخار کی چبھتی' چیرتی نگاہوں اور پھنکارتی سانسوں کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔خاصے روکھے پن سے بولا:

''مجھے پتہ چلا ہے کہ آج تم شہباز منزل گئے تھے''

''بالکل درست' بلکہ تمہاری کمی محسوس کی گئی تھی۔ بہر حال آج کی صحبت بڑی خوشگوار رہی''

''ہاں مجھے بھی اس کی خوشگواری کی اطلاع ملی ہے۔ مس نفیسہ کہہ رہی تھی کہ تم نے اسے کل کے لئے کشتی رانی اور پک نک کی دعوت دی ہے''

''بالکل دی ہے دریا کی اوپر کی طرف جائیں گے''

''تم دریا کے نزدیک بھی نہیں جاؤ گے''

''کیوں؟''

اس لئے کہ تم ابھی مس نفیسہ کے نام رقعہ لکھو اور اس میں اسے بتاؤ گے کہ تمہیں غیر متوقع طور پر واپس پنڈی جانا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا پکنک کا پروگرام منسوخ کیا جاتا ہے۔

''لیکن مجھے تو کسی نے بھی پنڈی جانے کو نہیں کہا۔''

''میں جو کہہ رہا ہوں''

افتخار کھڑا تھا' رانا بیٹھا تھا اور براہ راست افتخار کی زد میں تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش تو کرنا چاہی لیکن یہ ایسی کامیاب کوشش نہ تھی۔ چنانچہ بیٹھے بیٹھے ہی بولا:

''کیپٹن' مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آ رہیں۔''

''تو میں تمہیں اور آسان الفاظ میں بتا دیتا ہوں۔ صبح یہاں سے ایک بڑی آرام بخش ٹرین راولپنڈی جاتی ہے اور کل تم اس میں پنڈی جا رہے ہو۔''

''اور اگر نہ گیا تو؟''

''تو اس صورت میں میں یہاں دس بجے آؤں گا اور اگر تجھے یہاں موجود پایا تو...... ( کیپٹن نے اپنے مکے کو غور سے دیکھا ) شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں فوج کا باکسنگ کا ہیوی ویٹ چیمپئن ہوں۔''

رانا سنبھلا' اٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

''تو تم چیمپئن ہو' شوقیہ چیمپئن یا پیشہ ور قسم کے؟''

''شوقیہ مسٹر' شوقیہ' فوجی افسر پیشہ ور باکسر نہیں ہوتے۔''

''تو شوقیہ چیمپئن صاحب' شاید یہ اطلاع آپ کی دلچسپی کا باعث ہو کہ یہ خاکسار ایک عرصہ پیشہ ور باکسر رہا ہے لیکن جب میرے آخری مخالف کو ایک ٹوٹا ہوا جبڑا لے کر ہسپتال جانا پڑا تو میں نے یہ وحشیانہ کھیل ترک کر دیا اور شاعری پڑھنا شروع کر دی۔''

رانا نے یہ کھوکھلی ڈینگ مارنے کو تو مار دی لیکن کیپٹن افتخار نے رخصت ہوتے ہوئے جس قاتلانہ انداز میں رانا کی ٹھوڑی کی سمت اپنے مکے سے اشارہ کیا وہ ہر چند کہ علامتی تھا تاہم خاصا عبرت آموز تھا بلکہ ایک لمحہ کے لئے رانا کو بھی اگلی صبح کی ٹرین میں چند خوبیاں نظر آنے لگیں۔

لیکن خیر' یہ بزدلی کا عارضی وقفہ تھا۔ نفیسہ کی متوقع ملاقات کے احساس نے اسے ایک عجیب قوت بخش دی۔ سوچنے لگا' آخر میں نے خود ہی نفیسہ کو پکنک کی دعوت دی ہے لہٰذا دعوت پر قائم رہنا بھی میرا فرض ہے باقی رہا کیپٹن افتخار تو اگر وہ سامنے آ ہی گیا تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ خدا نے اسے گینڈے کا ڈیل ڈول دیا ہے تو مجھے ہرن کی سی دو ٹانگیں دی ہیں۔ اگر اس نے میرا پیچھا کیا تو آخر تھک ہار کر بیٹھ جائے گا اور پھر میں ہوں گا اور نفیسہ!

اگلے روز مقررہ وقت سے گھنٹوں پہلے رانا ہوٹل سے نکل کر کشتی میں جا بیٹھا اور لگا نفیسہ کا انتظار کرنے۔ یوں بھی سرما کی ابتدائی ملائم سے دن تھے اور محبوب سے ملنے کے جملہ لوازم موجود تھے' وہ نیلا آسمان' وہ اجلے بادل' وہ سطح آب پر نقرئی لہریں' وہ بادِ نسیم کے جھونکے' وہ چہچہاتے پرندے وہ ہر جانب نغمہ و نکہت کے کارواں! ان انتظار کے لمحوں میں رانا نے مرقع چغتائی کھول لیا اور پہلی غزل کو ایک بار پھر الٹنا شروع کیا معاً اس کے کانوں میں گھاٹ کی طرف سے معاً بیگانہ سی آواز آئی۔ اس نے دیکھا تو سامنے نفیسہ کی چھوٹی بہن فری کھڑی تھی۔ رانا جھٹ بولا:

''او ہیلو فری''

''ہیلو' مسٹر رانا'' فری نے جواب دیا۔

جب سے رانا کو شہباز منزل سے تعارف ہوا تھا' چھوٹی فری اس کی نگاہ میں ایک فالتو پرزے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے فری کو وقتاً فوقتاً دیکھا ضرور تھا اور اس پر مشفقانہ انداز میں مسکرایا بھی تھا کہ اپنی محبوبہ کے پیاروں سے پیار کرنا عشاق کی پرانی ضرورت ہے' لیکن نفیسہ سے پہلے فری کا آ نکلنا کوئی اچھا شگون نہ تھا۔ بہرحال رانا نے خوش خلقی کی ابتدا کرتے ہوئے کہا:

''کیا خوبصورت دن ہے فری''

''دن تو کافی خوبصورت ہے'' فری نے جواب دیا۔ ''مگر میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ باجی نفیسہ نہیں آ سکتی''

یہ سنا تو رانا کی نگاہ میں نیلا آسمان' اجلے بادل اور نقرئی لہریں سب دھندلانے لگیں۔ بہر حال اس امید پر کہ شاید فری شرارت کے موڈ میں ہو' بولا:

''مجھے معلوم ہے تم مذاق کر رہی ہو۔''

''نہیں تو مسٹر رانا۔ ویسے میں اکثر مذاق کرتی ہوں مگر اب نہیں کر رہی''

''یعنی نفیسہ سچ مچ نہیں آئے گی؟''

''بھئی بات یہ ہے کہ گھر میں مہمان آ گئے ہیں امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سارا انتظام باجی کو کرنا پڑ گیا ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ''

''مگر باجی چاہتی ہے کہ اس کی بجائے آپ مجھے کشتی میں لے چلیں۔ وہ مہمانوں سے فارغ ہو کر دریا کے اگلے موڑ پر ہمیں آ ملے گی''

رانا کو آسمان پھر کچھ نیلا' بادل کچھ اجلے اور لہریں کچھ نقرئی نظر آنے لگیں۔

مہمان کم بخت بڑے غلط وقت پر آئے تھے تاہم نفیسہ کا دیر سے آنا نہ آنے سے تو ہزار درجہ بہتر تھا۔ رہی چھوٹی فری کی عارضی رفاقت تو رانا نے اس میں بھی ایک خوشگوار پہلو ڈھونڈ لیا تھا۔ رانا کا منصوبہ تھا کہ فری کو کچھ کھلائیں گے' پلائیں گے' ہنسائیں گے' پھر ہماری مہمان نوازی اور خوش

مزاجی کے قصے نفیسہ تک پہنچیں گے۔ اور یہ تو تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ محبوبہ کی چھوٹی بہن کی تواضع کبھی ضائع نہیں جاتی چنانچہ رانا نے نہایت خوشدلی سے فری کو کشتی میں داخل ہونے کی دعوت دی۔

رانا کھینے لگا اور کشتی چل پڑی۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ فری کی نگاہ مرقعِ چغتائی پر پڑی۔ اس نے فوراً کتاب کھولی اور جب دیکھا کہ سرورق پر دیوانِ غالب لکھا ہے تو ذرا حیران ہو کر بولی:

''مسٹر رانا کیا تم آج کل دیوانِ غالب پڑھ رہے ہو؟''

''آج کل نہیں ہمیشہ پڑھتا ہوں۔ جب بھی پانچ سات منٹ مل جائیں، میں دیوانِ غالب کھول لیتا ہوں اور اسی میں گم ہو جاتا ہوں۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہیں غالب بہت پسند ہے۔''

''کوئی غالب کو ناپسند بھی کر سکتا ہے؟''

''میں ناپسند کرتی ہوں۔ باجی نفیسہ نے مجھے غالب پڑھنے اور سننے پر مجبور کیا مگر میں نے تو اسے پھسپھسا پایا۔''

''نہیں فری، غالب پھسپھسا نہیں۔ بڑا ٹھوس شاعر ہے۔''

''ٹھوس نہیں، ٹھس ہے۔''

''تم یہ بتاؤ تمہیں کون سا شعر پھسپھسا لگا؟''

''سارے شعر''

''کسی ایک کا نام لو''

''مثلاً وہی عشرتِ قطرہ والا''

اب رانا کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ شعر کون سا ہے کس غزل میں ہے۔ بولا:

''ذرا دکھاؤ تو یہ شعر کہاں ہے کتاب میں؟''

فری نے چند اوراق الٹے اور بولی" یہ رہا؟"

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب فری شعر کے الفاظ سے تو کچھ مانوس تھی لیکن اس کے معنوں تک پہنچنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ ادھر رانا صاحب بھی بالکل کورے تھے لیکن اب انہوں نے فری کو ثابت کرنا تھا کہ شعر پھسپھسا نہیں' معنی خیز ہے، چنانچہ معنی بیان کرنا شروع فرمائے:

"دیکھو نا عزیزہ، عشرتِ قطرہ جو ہے نا' تو عشرت ایک لڑکی کا نام ہے جیسا کہ تمہارا نام فرحت یا فری ہے۔ دریا سے مراد کوئی دریا ہو سکتا ہے' مثلاً یہی دریائے جہلم' تو غالب اس لڑکی عشرت کو بتا رہا ہے کہ اے چھوٹی لڑکی عشرت' دریا میں نہانے سے مت ڈرو دریائی غسل تو ہر درد کی دوا ہے۔"

"سچ؟"

"بالکل سچ' غالب جھوٹ نہیں بولتا۔"

"تو پھر عشرت نے دریا میں نہا لیا؟"

"فوراً"

"اسے کہاں درد تھا؟"

"کہیں ہوگا۔"

رانا اب مضمون بدلنا چاہتا تھا کہ غالب کے موضوع پر فری کے سوال اسے چکرانے لگے تھے۔ بولا" چلو اب شعر کا مطلب تو ہو گیا۔ بتاؤ چھوٹا چمن کتنا دور ہے جہاں باجی آ کر ہمیں ملے گی؟"

"بس اگلے موڑ کے ساتھ"

کوئی نصف گھنٹے کی کشتی رانی کے بعد چھوٹا چمن آ گیا۔ رانا نے کشتی کنارے سے لگائی اور ایک کھونٹے سے باندھ دی، پھر چاروں طرف دیکھا تو چھوٹا چمن ایک نہایت پُر فضا مقام پایا۔ ہر طرف درخت اور ہریالی اور ایک عجیب سے خاموشی' حدِ نگاہ تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔

صرف درختوں کے درمیان سے ایک چھوٹا سا خوبصورت سا مکان دکھائی دیتا تھا۔ اور ہاں کشتی سے قریب ہی کسی وجہ کے بغیر ایک معمر سا گھوڑا گھاس چر رہا تھا۔ رانا کے ذہن میں رہ رہ کر خیال آتا کہ کاش اس مکمل تنہائی کے ماحول میں فری کی بجائے نفیسہ ساتھ ہوتی پھر دونوں کسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہوکر بیٹھ یا لیٹ جاتے اور باہم مل کر دیوانِ غالب پڑھنا شروع کر دیتے۔ حتیٰ کہ بالآخر دو قالب اور ایک جان محسوس کرنے لگتے اور..........اتنے میں فری بولی:

''مجھے بھوک لگی ہے.....''

خود رانا کو بھی دریا کے مخالف کشتی چلانے کے بعد بھوک ستا رہی تھی، چنانچہ اس نے لنچ باکس کھولا اور دونوں کھانا کھانے لگے۔ ختم کر چکے تو رانا کو نیند نے آ گھیرا۔ نفیسہ کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ فری زمین پر لکیریں کھینچ کر چینچی ٹاپو کھیلنے لگی۔

رانا بولا'

''دیکھو فری! تم تو کھیل رہی ہو میں ایک دو گھڑی سو نہ لوں؟''

''ضرور ضرور''

''مگر تم جانا کہیں نہیں' بس کھیلتے رہنا''

''تم فکر نہ کرو''

چنانچہ رانا سو گیا اور خدا جانے کتنی دیر سویا مگر جاگا تو کیا دیکھتا ہے' فری غائب ہے۔ فوراً اٹھا۔ اِدھر دیکھا' اُدھر دیکھا۔ زور زور سے پکارا: فری' فری' کہاں ہو فری؟'' مگر کوئی جواب نہ ملا اور پھر کیا دیکھتا ہے کہ دریا میں فری کی لاش پڑی تیر رہی ہے۔ رانا غریب کا دل دھک سے رہ گیا کہ یہ سانحہ جتنا غیر متوقع تھا اتنا ہی المناک بھی تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ نفیسہ کو کیا جواب دے گا۔ معاً خیال آیا کہ شاید فری ابھی زندہ ہو۔ فوراً کپڑوں سمیت دریا میں کودا اور تیرتا ہوا فری تک پہنچا اور دونوں ہاتھوں سے اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر افسوس یہ تو فقط فری کے کپڑے تھے۔ ان میں فری نہ تھی۔

فری کی گمشدگی کی تشویش تو تھی ہی مگر اب کہ وہ گیلے کپڑوں کے ساتھ واپس ساحل پر پہنچا تو اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ خاصی سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ اب ایک بالکل خشک کپڑوں کا جوڑا ہی اسے نمونیہ سے بچا سکتا تھا لیکن اس سنسان ساحلِ دریا پر ایسا جوڑا کہاں؟ اچانک اس کی نگاہ اس چھوٹے سے بنگلے پر پڑی جو کچھ دیر پہلے اسے درختوں کے درمیان سے نظر آیا تھا۔ عام حالات میں رانا کسی اجنبی سے جا کر خشک کپڑوں کا سوال نہ کرتا۔ وہ تو گھنٹوں سینما میں سگریٹ پیئے بغیر بیٹھا رہتا مگر اپنے ہمسائے سے دیا سلائی تک نہ مانگتا مگر اب حالات سراسر مختلف تھے۔ سوال سگریٹ پینے یا نہ پینے کا نہ تھا بلکہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ والہانہ دوڑ لگائی اور بنگلے کے دروازے پر جا دستک دی۔ جواب نہ ملا تو بولا ''کوئی ہے؟'' کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ رانا نے اللہ کا نام لیا دروازے کو دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔

رانا مالکِ مکان کی عدم موجودگی پر کچھ خوش بھی نہ تھا۔ خواہ مخواہ اس کے آگے ایک طویل بیان بلکہ بیان صفائی دینا پڑتا وہ سیدھا اوپر کی منزل میں ایک بیڈ روم میں گیا۔ الماری کھولی اور ایک نہیں کئی سوٹ ٹنگے نظر آئے اس نے سرج کا ایک بانکا سا سوٹ نکالا دراز سے سلک کی قمیص، ایک ریشمی ٹائی اور ایک اونی سویٹر چنا اور گیلے کپڑے اتار کر تازہ جوڑا پہننا شروع کیا قمیض پہنتے ہوئے سامنے ایک تصویر پر نظر جو پڑی تو ٹھٹھک کر رہ گیا یہ تو کوئی مانوس صورت لگتی تھی۔

یہ تو کیپٹن افتخار کی تصویر تھی، وہی توانا جسم، تیز نگاہیں، ہاتھوں میں باکسنگ کے دستانے اور گود میں چاندی کا کپ رانا اپنی قسمت کا ماتم کرنے لگا جو دوسری مصیبتوں کے درمیان اسے ایک مہلک قسم کے رقیب کے گھر لے آئی تھی اور ابھی اچھی طرح ماتم کی ابتدا بھی نہ کر پایا تھا کہ اسے کھڑکی سے ایک شخص بنگلے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ غور سے دیکھا تو کیپٹن افتخار تھا جو گویا چند ہی لمحے بعد بنگلے کے دروازے سے داخل ہونے والا تھا اور بدبختی کی انتہا دیکھیں کہ رانا داخل ہوتے وقت تیزی میں یہ دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا۔

رانا میں کوئی اور خوبی تھی یا نہیں، تیز پا بھی تھا اور تیز دماغ بھی، وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نچلی

منزل میں آیا۔ تیر کی طرح دروازے کے پاس پہنچا اور پیشتر اس کے کہ کیپٹن قدم اندر رکھتا' رانا نے اندر سے چٹخنی لگا دی۔

کیپٹن کے منہ سے دو نا قابلِ تحریر الفاظ نکلے اور بجا طور پر نکلے کہ دروازہ اس تیزی سے بند ہوا تھا کہ وہ اپنی ناک پورے طور پر پیچھے نہ کھینچ سکا تھا۔

رانا اپنی کارکردگی پر ذرا مطمئن ہو ہی رہا تھا کہ کیپٹن کونے کا چکر لگا کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کی طرف دوڑتا ہوا نظر آیا جیسے کھڑکی سے داخل ہو کر بائیں پہلو سے حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ایک لمحہ کے لئے رانا کانپ سا گیا۔ مگر اس کے پاؤں کی چستی اور ذہن کی تیزی پھر کام آئی وہ اندر سے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کی طرف بھاگا ایک فاصلے سے اسے نظر آیا کہ کیپٹن افتخار کی ایک ٹانگ اور کہنی کھڑکی کی سل تک پہنچ گئے ہیں۔ عین اسی لمحے رانا کی نگاہ ایک قد آدم جھاڑو پر پڑی جو بنگلے کا خاکروب ایک کونے میں رکھ گیا تھا۔ رانا نے جھاڑو اُٹھایا اور کھڑکی میں داخل ہوتی ہوئی ٹانگ اور کہنی پر اس زور سے دے مارا کہ ٹانگ اور کہنی کے مالک کی چیخ نکل گئی۔ مگر اس عمل کے دوران کیپٹن نے کھڑکی کے شیشوں سے اپنے بن بلائے مہمان کو پہچان لیا۔ افتخار کو اور طیش آیا اور رقیب رُوسیاہ کے پانچ سات ٹکڑے کرنے کی غرض سے بنگلے کے عقب سے اگلی کھڑکی کی طرف لپکا۔ رانا میں اب جھاڑو کے باوجود اتنی جان نہ تھی کہ کیپٹن کا کسی دوسری کھڑکی کے محاذ پر مقابلہ کرتا۔ اسے کھڑکی پر مورچہ جمانے کی بجائے بڑا دروازہ کھول کر باہر بھاگ نکلنے کی سوجھی، خطرہ تو اس میں بھی تھا کہ دروازہ کھلنے پر آگے کیپٹن استقبال کے لئے نہ کھڑا ہو مگر اس نے یہ خطرہ قبول کیا۔ آناً فاناً اندر سے دروازہ کھولا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ افتخار موجود نہ تھا...... وہ کسی پچھلی کھڑکی سے دست و گریبان تھا۔

رانا نے ایک طوفانی دوڑ لگائی اور وہ خطرے کی حدود سے باہر تھا۔ رانا نے اطمینان کا سانس لیا لیکن پوری طرح نہ لے پایا تھا کہ اس پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا اس نے کوٹ، قمیص اور جوتے تو پہن رکھے تھے مگر پتلون ابھی نہیں پہنی تھی۔

ایسی حالت گدائی کسی شریف آدمی کے لیے بھی باعث رسوائی تھی اور رانا جیسے مستعلیق جوان کے لئے جس کی خوش پوشی کے ساری کلب میں چرچے تھے قیامت تھی۔ شرم کے مارے اس کی جان نکلی جارہی تھی۔ بار بار اس کے منہ سے نکلتا ''آج مارے گئے''۔ وہ ناامیدی کے ایک اتھاہ گڑھے میں بتدریج غرق ہورہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہے سامنے کیپٹن افتخار کی دوسیٹوں والی سرخ رنگ کی کار کھڑی ہے کار کا دیکھنا تھا کہ رانا کے ذہن میں ایک ترکیب نے کروٹ لی۔ سوچنے لگا۔ گردن سے نیچے کمر تک تو خاصا سمارٹ طور پر ملبوس ہوں۔ باقی جسم کو اگر کمبل سے ڈھانپ لیا جائے تو میری نیم عریانی کا کسے شبہ ہوسکتا ہے، چنانچہ اس نے اپنی ترکیب پر فوری عمل کیا۔ اس نے زندگی میں کبھی کار نہیں چرائی تھی، مگر اب اسے ذرا بھی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ پھرتی سے ڈرائیور کی نشست میں بیٹھا، ٹانگوں پر کمبل لپیٹا، انجن سٹارٹ کیا اور پھر یہ جا وہ جا۔

رانا کا خیال تھا سیدھا ہوٹل جاؤں وہاں پہنچ کر کمبل کی دھوتی پہنے تیزی سے کمرے میں پہنچوں گا۔ مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ پائے گا۔ اگر کسی بیرے نے دیکھ بھی لیا تو یہ سمجھے گا صاحب فینسی ڈریس کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ کمرے میں جاکر کپڑے بدلوں گا اور پھر منٹوں میں وہیں آجاؤں گا جہاں سے کار چرائی تھی۔

لیکن وہ کیا کہتے ہیں تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ، رانا کار چلا کر ابھی ایک کلومیٹر بھی نہ گیا ہوگا کہ سامنے ایک نوجوان لڑکی ایک جھاڑی کے پیچھے سے نکل کر سڑک پر آکھڑی ہوئی اور رانا کو کار ٹھہرانے کے لئے ہاتھ لہرانے لگی۔ معلوم ہے یہ لڑکی کون تھی؟''

نفیسہ!

عام حالات میں تو رانا نفیسہ کو دیکھتا تو اس کی دنیا آباد ہوجاتی مگر وہ موجودہ حالات میں رانا کو اپنی دنیا ویران لگی۔ اس نے کار روکی اور نفیسہ کے چہرے پر نظر جمائی تو اس پر کہیں بھی خوش آمدید لکھا نہ پایا۔ وہ حیران تھا نفیسہ کی بے رخی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ بہر حال رانا نے ابتدائے کلام کی:

''السلام علیکم آخر آپ کو لنچ سے فراغت مل ہی گئی''

''ہاں مل گئی'' نفیسہ کا جواب مختصر تو تھا ہی لیکن خشک کہیں زیادہ تھا۔ اب رانا نے نفیسہ کو فری کی گمشدگی کی خبر سنانا تھی وہ ہزار چاہتا کہ کاش یہ خبر بد مجھے نہ سنانا پڑتی لیکن مجبوری تھی۔ آخر یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ اپنی محبوبہ کی سالم چھوٹی بہن کو گم کر دیں۔ یہاں تک کہ اس کے مر جانے کا امکان بھی ہو اور یہ سارا واقعہ پی جائیں، چنانچہ وہ ذرا کھانسا اور بولا:

''تو ہاں' نفیسہ' ایک عجیب افسوسناک واقعہ ہوا ہے' بالکل غیر متوقع! مجھ سے فری کھو گئی ہے''

''مجھے معلوم ہے اور وہ مجھے مل بھی گئی ہے۔'' نفیسہ نے لاپروائی سے کہا

''سچ؟ کہاں ہے فری؟''

عین اسی لمحے قریب کی جھاڑی سے ایک بچگانہ مگر اونچی آواز بلند ہوئی جسے رانا سُن کر بدک سا گیا۔

''میں یہاں ہوں''

رانا نے فری کی آواز سنی تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ نفیسہ سے پوچھنے لگا:

''یہ سچ مچ فری کی آواز ہے؟''

''اسی کی ہے'' نفیسہ کی سرد مہری واضح تھی۔

''لیکن وہاں جھاڑی میں بیٹھے کیا کر رہی ہے؟''

''وہ کچھ بھی نہیں کر رہی' وہ چھپ کر بیٹھی ہے کہ اس کے بدن پر کچھ نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ وہ ننگی ہے' ایک گھوڑے نے اس کے کپڑوں کو دولتی ماری اور وہ دریا میں بہہ گئے''

''نہیں نہیں'' جھاڑی سے فری چیخی ''ایسے نہیں ہوا تھا مسٹر رانا۔ ہوا یہ تھا کہ میں نے کپڑے اتار کر دریا کے کنارے رکھے اور خود نہانے کے لئے دریا میں اتر گئی۔ کیونکہ چینی کھیلنے سے

میرے پاؤں میں درد تھا اور تم نے کہا تھا دریا میں نہانے سے درد ٹھیک ہو جاتا ہے میں ابھی دریا میں ہی تھی کہ ایک ہوا کا جھونکا آیا اور میرے کپڑے اڑا کر دریا میں لے گیا۔ پھر مجھے جھاڑی میں چھپنا پڑا۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔"

رانا نے یہ آخری الزام سنا تو سر پکڑ کر رہ گیا۔ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ کاش میں کھانے کے بعد سو نہ جاتا اور یہ بدتمیز چھوکری یہ خطرناک حرکت نہ کرتی۔ آخر یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ اگر عورت ذات پر کوئی مشکل وقت آئے تو وہ الزام قریب ترین مرد پر دھرتی ہے۔ ذرا بلند آواز میں فری کو مخاطب کرتے ہوئے بولا:

"مگر فری، میں نے تمہیں دریا میں کودنے کا کب مشورہ دیا تھا؟"

"تم نے کہا نہیں تھا کہ غالب کی عشرتِ قطرہ والی غزل کا مطلب یہ ہے کہ دریائے جہلم میں نہانا ہر درد کی دوا ہے؟ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس لڑکی عشرت کا درد بھی نہانے سے ٹھیک ہو گیا تھا۔"

"فری بالکل ٹھیک کہتی ہے" نفیسہ کسی قدر جھلا کر بولی "تم نے خواہ مخواہ اس کے معصوم ذہن میں اوٹ پٹانگ خیالات ٹھونس دیئے اور غالب کے شعر کا کباڑہ الگ کر دیا۔"

"لیکن بات دراصل یہ ہے نفیسہ کہ............"

"بات اتنی ہے کہ فری غریب تمہاری باتوں میں آ گئی۔"

"مگر دیکھو نا۔ ہوا یہ کہ......"

"رہنے دو جو کچھ بھی ہوا۔ سوال اب فری کو سردی سے بچا کر گھر لے جانے کا ہے۔ کیا تم اسے کار میں گھر پہنچا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں، بصد شوق" رانا کو نفیسہ کی خوشنودی کا پہلا موقع ملا تھا۔

"تو پہلے ذرا یہ کمبل دے دو" نفیسہ نے رانا کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "بے چاری کو ڈھانپ دوں، سردی سے کانپ رہی ہے اور کچھ پہنا ہوا بھی نہیں۔"

کمبل کا نام سننا تھا کہ رانا کے گرد پوری دنیا مع نفیسہ نے چکر لگایا۔ دور دریا کے کنارے

وہ معمر گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ رانا کو محسوس ہوا کوئی خوفناک دیو اس کی بے بسی پر قہقہہ لگا رہا ہے۔ شام کی ٹھنڈی ہوا بدستور سرگوشیاں کرتے درختوں سے گزر رہی تھی' اور پرندے حسب معمول جھاڑیوں کی اوٹ میں چہچہا رہے تھے لیکن جن کانوں میں دیو قہقہے لگا رہے ہوں' وہاں ان نرم و نازک آوازوں کا گزر کیسے ہو؟

رانا بدحواسی میں جواب نہ دے سکا تو نفیسہ دوبارہ بولی:

''شائد تم نے سنا نہیں' ذرا کمبل دے دو''

نفیسہ کو جواب دینے سے پہلے رانا نے ہوا کا ایک گولہ نگلا اور بولا:

''کمبل؟ یہ تو ذرا مشکل ہے''

نفیسہ حیرت اور غصّے میں چلّائی ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس بچی کے لئے' میری بہن کے لئے' تم کمبل تک نہیں دے سکتے؟''

''مجھے افسوس ہے' نفیسہ'' رانا نے آہستہ سے کہا۔

''مسٹر رانا۔ لاؤ' دو مجھے وہ کمبل فوراً''

رانا نے نفیسہ پر ایک لمبی' ارمان بھری نگاہ ڈالی جس میں پشیمانی' معذرت اور مجبوری نصف برابر موجود تھیں۔ پھر دفعتاً ایکسلریٹر پر پاؤں رکھا اور کار فرانٹے بھرتی ہوئی شام کے سایوں کے درمیان آگے چل نکلی .......... دور کہیں' جہلم کے مضافات سے بھی آگے جب شام کا دھندلکا اور گہرا ہو گیا تو رانا کو ایک کھیت میں ڈراوے کا پتلا Scare-Crow نظر آیا۔ وہ فوراً کار سے اُترا۔ ڈراوے کا پاجامہ اتار کر زیب تن کیا اور پنڈی کا رخ کیا۔

اِن دنوں' رانا پنڈی کے ایک نامعلوم محلے میں رہ کر داڑھی بڑھا رہا ہے کہ کیپٹن افتخار کے تعاقب سے محفوظ رہ سکے۔ آج صبح چھپ چھپا کر مجھے ملنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں دیوانِ غالب کا یہ چغتائی ایڈیشن تھا۔ کہنے لگا کتاب بالکل نئی ہے۔ لیکن کسی کو دلچسپی ہو تو نصف قیمت میں خرید سکتا ہے...... دراصل رانا کو غالب سے کچھ چڑ سی ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں آج ہی اسے نفیسہ کا ایک خط ملا

ہے جس میں لکھا ہے ''میں تمہیں سب قصور بخش سکتی تھی مگر غالب کے شعر کی آبروریزی معاف نہیں کر سکتی۔ اب شہباز منزل آنے کی کوشش نہ کرنا۔'' ان حالات میں رانا سمجھتا ہے کہ اس کے لئے دیوان غالب کا کوئی مفید استعمال باقی نہیں۔

# اخباری رپورٹر

جونہی میں اپنی تقریر ختم کر چکا وہ ہاتھ میں کھلی نوٹ بک اٹھائے سٹیج پر چڑھا اور لپک کر مجھ سے مخاطب ہوا!

''میں روزنامہ خیابان کا رپورٹر ہوں۔ بدقسمتی سے میں آپ کی تقریر نہ سن سکا۔ براہ کرم اپنی تقریر کی چیدہ چیدہ باتیں بتا سکیں گے؟''

میں نے کہا ''تو کیا آپ تقریر کے وقت ہال میں موجود نہ تھے؟''

بولا ''جی نہیں۔ میں اس وقت ہاکی میچ دیکھ رہا تھا۔''

پوچھا ''تو آپ ہاکی میچ بھی رپورٹ کرتے ہیں؟''

کہنے لگا ''نہیں صاحب' میں تو سینئر آدمی ہوں ایسے چھچھورے کام نہیں کرتا۔ وہ تو میچ ذرا دھڑلے کا تھا۔ دیکھنے چلا گیا۔ ہاں تو آپ کا لیکچر کس موضوع پر تھا؟''

کہا ''اس کا عنوان تھا'' سائنس کی حیرت انگیز پیش رفت۔''

بولا ''اچھا تو سائنس پر تھا۔'' اور ساتھ ہی اس نے تیزی سے کچھ نوٹ بک پر لکھا جلد ہی رک گیا اور اچانک کہنے لگا'' ذرا حیرت کے ہجے تو بتا دیں۔ ح حلوے والی ہوتی ہے نا؟''

---

"The Reporter" By Stephen Leacock.

''جی ہاں۔ بالکل حلوے والی'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بولا'' میرا بھی یہی خیال تھا۔ اب ذرا آپ کی تقریر کے متعلق میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا مرکزی خیال کیا تھا؟ میرا مطلب ہے' خیر' مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے''۔

کہا'' مرکزی خیال یہ تھا کہ ریڈیائی تابکاری ایٹم کی بناوٹ پر کیا روشنی ڈالتی ہے۔''

بولا'' ذرا ٹھہریں۔ میں نوٹ کرلوں.........ریڈیائی تابکاری.............'' میں نے دخل دیتے ہوئے اصلاح کی کوشش کی اور کہا نابکاری نہیں' تابکاری۔''

''شکریہ' شکریہ۔ ریڈیائی تابکاری..........بناوٹی روشنی......وغیرہ وغیرہ' جی ہاں میں سمجھ گیا۔'' اس کے بعد اس نے نوٹ بک بند کردی اور سوال کرنے لگا۔

''کبھی پہلے بھی آپ یہاں آئے ہیں؟''

''جی نہیں۔ یہ میرا پہلا موقع ہے۔''

''کیا آپ کا قیام نئے ہوٹل میں ہے؟''

''جی ہاں''

''ہوٹل پسند آیا؟''

''بالکل بہت آرام دہ جگہ ہے''

اس نے نوٹ بک کھولی اور اس پر کچھ گھسیٹا۔ پھر اگلا سوال کیا:

''کیا آپ نے وہ نیا بوچڑ خانہ بھی دیکھا ہے جو ٹاؤن کمیٹی نے بنوایا ہے؟''

''نہیں دوست۔ میں نے تو اس کے متعلق کچھ سنا بھی نہیں۔''

''جناب یہ تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا مذبح ہے۔ آپ یقیناً اس کے متعلق کچھ کہنا چاہیں گے۔''

''بھئی' میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ کیا کہہ سکتا ہوں؟''

اس نے کچھ نوٹ بک میں لکھا اور ذرا توقف سے بولا۔

''آپ مقامی کمیٹی کے نئے سکینڈل کے متعلق کیا فرمائیں گے؟''

''مجھے تو کسی سکینڈل کا علم نہیں۔''

''کیا آپ کے خیال میں کمیٹی کے اکثر ممبر راشی ہیں؟''

''بھئی، میں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا''۔

''بالکل۔ بھلا آپ کو کیا معلوم! ویسے عام طور پر آپ کے خیال میں یہ لوگ راشی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟''

میں نے کہا'' ہو تو سکتے ہیں بلکہ بعض اوقات پارٹی بازی میں یہ چنڈال چمچے بن جاتے ہیں۔''

''آہا! کیا بات کہہ دی آپ نے! چنڈال' چمچے۔ بھئی واہ۔'' رپورٹر جھوم اٹھا اور بولتا چلا گیا'' بات ہوئی نا۔ چنڈال چمچے! یہ چیز ہے جو ہمارے اخبار کے ماتھے پر زیور کی طرح سجے گی۔ لیکچروں میں کیا رکھا ہے۔ خشک فارمولے اور مشکل مساواتیں۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اچانک اس نے اگلا سوال کر ڈالا

''کیا ان چنڈالوں نے مذبح کی تعمیر سے لاکھوں کے حساب سے ہاتھ رنگے ہوں گے''؟

''نہیں میاں، مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں۔''

''لیکن دیکھیں نا' آپ کے خیال میں یہ بات ممکن تو ہے''؟

''بھئی میں اس باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا''

''چلیں، اس بات کو یہیں رہنے دیتے ہیں۔ بہر حال بہت بہت شکریہ۔ امید ہے آپ کبھی پھر تشریف لائیں گے۔ خدا حافظ''۔

اگلی صبح گھر جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوا تو تازہ اخبار پر نگاہ پڑی دو کالمی خبر کے اوپر جلی سرخی تھی اور پھر ذیلی سرخی: ''ٹاؤن کمیٹی کے ارکان چنڈال چمچے ہیں۔'' ''ممتاز پروفیسر کا سائنس پر لیکچر''

رپورٹ میں لکھا تھا ''معروف سائنسدان عبدالرب نے مقامی میونسپل ہال میں ایک عظیم اجتماع کے سامنے نہایت دلچسپ لیکچر دیا: انہوں نے فرمایا کہ ہم ریڈیو تابکاری سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور مزید فرمایا کہ ٹاؤن کمیٹی کے ارکان چنڈال چمچے ہیں۔ مقرر نے ایٹم کی بناوٹ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ان کے ذہن میں مذبح کی تعمیر کے ضمن میں رشوت ستانی کے متعلق شدید شکوک تھے لیکن انہوں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔ پروفیسر صاحب کی تقریر سامعین نے انتہائی توجہ سے سنی اور بار ہا تالیاں بجا کر ان کو داد دی۔ تقریر کے انجام پر حاضرین نے جناب مقرر سے ایک بار پھر اسی شہر میں آ کر لیکچر دینے کی اِلتجا کی۔''

سو' یہ ہے جناب رپورٹر کا طریقۂ واردات لیکن کیا میں اس کی اس حرکت پر ناراض ہوا؟ بالکل نہیں۔ آخر کیوں ناراض ہوتا؟ کیا اس نے اپنی رپورٹ میں نہیں لکھا تھا کہ میں نے ایک عظیم اجتماع کے سامنے تقریر کی تھی۔ حالاں کہ ہال میں بمشکل پچاس ساٹھ آدمی تھے۔ کیا اس نے سامعین کی دلچسپی اور بار بار تالیاں بجانے کا ذکر نہیں کیا تھا؟ حالاں کہ تالیاں بجتیں تو رپورٹر سے بہتر میں سن سکتا تھا کیوں کہ وہ تو اس وقت ہاکی میچ دیکھ رہا تھا۔ آپ سچ جھوٹ کو جانے دیں۔ یہ دیکھیں کہ آخر ایک مقرر کو اس سے بہتر کیا رپورٹ چاہیۓ۔

جہاں تک ارکان کونسل کی رشوت ستانی اور خبر کے عنوان کے سنسنی خیزی کا تعلق ہے' تو یہ بے چارے رپورٹر کا قصور نہیں' ہمارا ہے! صبح کے اخبار میں ایسی چیختی چنگھاڑتی سرخیاں ہم قارئین کی ضرورت ہیں اور رپورٹر نہایت فرض شناسی سے ہماری یہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ سو' اس غریب سے خفا نہ ہوں۔ اسے نوٹ بک اور پنسل اٹھائے رات کی تاریکی میں سنسنی کی تلاش میں گلی کوچوں میں نکل جانے دیں۔ میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

# انجامِ محبت

اکتوبر کی ایک خوشگوار شام کو ہم پانچ چار دوست پنڈی کلب کے سبزہ زار میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور حسب معمول کسی خفیف مسئلے پر خاصی جلی بحث کر رہے تھے کہ ہماری نظر ملک اکبر علی اعوان پر پڑی جو بیٹھے تو ہمارے ساتھ ہی تھے لیکن ہماری موجودگی اور اپنی چائے سے بے نیاز بڑے مزے سے ایک خط پڑھتے جا رہے تھے اور مسلسل مسکراہٹ کے دوران کبھی ایک آدھ قہقہہ بھی خارج کر دیتے تھے۔

قدوس بولے "یہ کس خوشی میں مسکرایا جارہا ہے؟"

بشیر نے اصلاح کی "اردو ٹھیک بولو قدوس۔ ملک صاحب مسکرا ہی نہیں رہے قہقہا بھی رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ملک صاحب کی شادی کے امکانات کچھ زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔"

ملک اکبر علی بدستور مسکراتے ہوئے بولے: "معاملہ شادی کا نہیں لیکن بات خوشی کی ضرور ہے۔"

"تو اس خوشی میں ہمیں شامل نہ کیجئے گا؟" قادر نے ملک صاحب سے پوچھا۔

"ضرور ضرور" ملک بولے "بات یہ ہے کہ بڑی عجیب بات ہے۔ جانتے ہیں نا آپ

---

"Open House" By P. G. Wodehouse

میرے بھتیجے کو جو یہاں ٹینس کھیلنے بھی آیا کرتا تھا۔''

وہی گورا چٹا' چھ فٹا جوان جو پچھلے دنوں ملیشیا میں پاکستانی سفارت خانے میں قونصلر مقرر ہوا ہے؟'' قدوس نے اندازاً کہا۔

''بالکل وہی'' ملک اکبر علی بولے ''اس کا نام جاوید ہے' جاوید اعوان اور یہ اسی کا خط ہے۔ بڑا کامیاب قونصلر ثابت ہوا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جب اسے پہلی مرتبہ اس ملازمت کی پیش کش ہوئی تو اس نے اسے مونگ پھلی کہہ کر ٹھکرا دیا تھا مگر ہر معاملے میں قسمت کا ایک اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔''

''تو کیا سچ مچ جاوید نے قونصلر بننے سے انکار کر دیا تھا؟'' قادر نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔

''بھئی' اسے تو اس خیال سے ہی نفرت تھی۔'' اکبر علی بولے حالانکہ یہ اسامی لیفٹیننٹ جنرل ارشاد حسین اعوان نے اپنے ذاتی رسوخ سے اسے دلوائی تھی۔ مگر جاوید کو علم ہوا تو کہنے لگا ''کیا بدذوقی ہے! آدمی پنڈی کی گلیاں چھوڑ کر کوالالمپور جا نکلے۔ میں نہیں جاؤں گا۔''

ملک نے کہانی جاری رکھی:۔

''دوسرے رشتہ دار تو جاوید کے انکار کو ضد بلکہ حماقت سمجھتے تھے لیکن مجھے یعنی اپنے پسندیدہ چچا کو...... وہ دل کی بات بتا دیا کرتا تھا۔ سو مجھے معلوم تھا کہ اس کے انکار کے دو ٹھوس اور جائز سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنی دولتمند مگر بیوہ پھوپھی کا اکلوتا اور نہایت ہی پیارا بھتیجا تھا اور اسے معلوم تھا کہ پھوپھی رفعت کی وصیت میں واحد نام جاوید ہے۔ دوسری وجہ اسے ایک پری وش دوشیزہ نیلوفر سے نیا نیا عشق ہو رہا تھا جس کی گرفت وہ ہر لحظہ تنگ تر محسوس کرتا تھا۔ ایک دن جب میں اسے اتاشی پن کے فوائد پر لیکچر پلا رہا تھا تو بولا'' چچا مجھے اتنا ہی بڑا احمق سمجھتے ہو؟ سادہ سی بات ہے پھوپھی رفعت کی خدمت اور خوشنودی ملیشیا کے اتاشی پن سے کہیں زیادہ زرخیز ہے۔ دوسری بات نیلوفر کی ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ میں اس کے ساتھ ملیشیا سے بذریعہ ڈاک عشق کر کے کامیاب ہو جاؤں گا تو معاف کیجئے گا میرے کنوارے چچا جان! یہ آپ کی خام خیالی اور ناتجربہ کاری ہے'' پھر آج صبح ہی

ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیلوفر آپ کے بھتیجے پر خاصی مائل ہے۔ان حالات میں اگر میں یہاں موجود رہا تو انشاء اللہ کچے دھاگے سے کھنچی آئے گی سرکار میری..... جاوید اکثر اعوانوں کی طرح شعروادب کا ذوق بھی رکھتا تھا۔

میں نے پوچھا ''تو آج صبح کیا واقعہ ہوا تھا؟ کیا نیلوفر سے ملاقات ہوئی تھی''

بولا ''نہیں'اس نے فون کیا تھا......اچانک گھنٹی بجی۔میں نے ریسیور اٹھایا تو آواز آئی۔

''ہیلو۔یہ تم ہو جاوید؟''

کہا ''جی۔حکم۔''

''حکم بھی ہے مگر پہلے تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں کل سوات جا رہی ہوں''

''نہیں'نہیں۔مت جاؤ''

''نہیں کا وقت گزر چکا ہے۔میں نے ٹکٹ بھی خرید لیا ہے۔تم یہ بتاؤ کہ میرا ایک کام کرو گے؟''

''کام تو دل و جان سے کروں گا مگر......''

''چھوڑو اگر مگر کو۔تم نے دیکھا ہوا ہے نا میرا کتا؟''

''تمہارا مطلب ہے وہ السیشن ٹائیگر؟''

''بالکل۔اور جانتے ہو نا میری سنہری چڑیا نازنین کو بھی؟''

''ہاں'دونوں سے تعارف ہے۔''

تو بات یہ ہے کہ میں ان دونوں کو ساتھ لے جا نہیں سکتی۔کیا تم میری غیر حاضری میں انہیں اپنے فلیٹ میں مہمان رکھ سکو گے؟''

''کہہ جو دیا ہے بہ دل و جان، محترمہ! ہم اعوان کھلا دروازہ اور وسیع دستر خوان رکھتے ہیں۔''

''شاباش اور شکریہ۔یہ دونوں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔بس' ٹائیگر کو ذرا ہر صبح پارک میں پندرہ بیس منٹ تیز تیز سیر کرا دینا اور جہاں تک اس کی خوراک کا تعلق ہے' کسی خاص

تکلف کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ تم خود کھاؤ گے وہ بھی کھا لے گا۔ گوشت، بسکٹ وغیرہ۔ ہاں کسی تیز مشروب سے پرہیز ہی کرنا۔

"ٹھیک ہے" جاوید بولا "اب ذرا بی بی نازنین کی خدمت کی ترکیب بھی بتا دو۔"

"ہاں تو نازنین خوراک کے معاملے میں ذرا وہمی سی ہے۔ خدا جانے کیوں اسے سفید دیمک سے عشق ہے۔ سو، دیمک مل جائے تو فبہا ورنہ کنگنی پر بھی گزارا کر لے گی۔ تھوڑا سا چاکولیٹ ملا لینا۔ سمجھ آ گئی ناں؟

"جی ہاں! آ گئی دیمک ورنہ کنگنی بشمول چاکولیٹ۔"

"شاباش! اور نازنین کے متعلق ایک اور ضروری بات۔"

"ارشاد"

"اسے دن میں دو مرتبہ پنجرے سے نکال کر کمرے میں اڑنے کی اجازت دینا تا کہ اس کی کمر تپلی رہ سکے۔ کمرے کے چند چکر اور پھر غسل کے بعد یہ خود بخود پنجرے میں داخل ہو جائے گی۔"

"ماشاء اللہ!"

"مجھے تعریف نہیں چاہئے جاوید یہ بتاؤ کچھ سمجھے بھی؟"

"کیوں نہیں جانِ من۔ ٹائیگر کے لئے تیز سیر اور نازنین کے لئے چست چکر"

"بالکل درست۔ اب صرف ایک بات کہنا باقی ہے ٹائیگر اور نازنین مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ ان کی حفاظت سچ مچ دل و جان سے کرنا"

"جی جانم۔ دل سے بھی کروں گا اور جان سے بھی۔"

بعد کے حالات کی روشنی میں تو یہ قول و قرار کچھ عجیب سے لگتے ہیں لیکن اس وقت جاوید کی سرشاری کا کچھ اور ہی عالم تھا وہ اس بات پر بھی نازاں تھا اسے سگِ یار کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔ اسے نیلوفر سے عشق تو تھا ہی، اسے یہ بھی یقین تھا کہ نیلوفر بھی اسے چاہتی ہے۔ آخر اس نے اپنے دوستوں کے وسیع حلقے سے اس ذاتی کام کے لئے جاوید ہی کو کیوں چنا تھا۔ اس انتخاب کے

یقیناً بڑے گہرے معنی تھے۔ دوسرے لڑکوں پر اس نے غور ضرور کیا ہوگا۔ مگر ایک ایک کر کے سب کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا ہوگا۔ جاوید کی خوشی بے اندازہ تھی اس کی خوشی کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ ہر چند کہ نیلوفر پنڈی سے باہر جا رہی تھی اور جاوید جانتا تھا کہ اس کی دید کے لئے آنکھیں ترس جائیں گی۔ مگر فائدہ یہ تھا کہ نیلوفر کی غیر حاضری میں وہ شازیہ سے آرام سے پیچھا چھڑا سکے گا۔ جی ہاں: یہ شازیہ بھی جاوید کی دوست بلکہ محبوبہ تھی مگر نیلوفر سے ملنے سے پہلے۔ نیلوفر نے پہلی ملاقات پر ہی شازی کو جاوید کے دل سے نکال کر کہیں پھینک دیا تھا۔ اب جاوید یہی اطلاع شازی کو پہنچانا چاہتا تھا مگر ذرا تدبر سے 'کڑوی گولی پر میٹھا خول چڑھا کر............

دراصل یہ عہدِ حاضر کے ہر نوجوان کا مسئلہ ہے۔ انتخاب میں اس قدر جلد باز واقع ہوا ہے کہ لڑکی ''الف'' کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتا ہے اور ابھی اپنے انتخاب پر ناز کرنا شروع کرتا ہی ہے کہ لڑکی ''ب'' اس کا راستہ کاٹتی ہے اور پھر ب کا دیوانہ وار تعاقب شروع کر دیتا ہے اور الف سے جان چھڑانے کے منصوبے بنانے لگتا ہے...... جاوید نے بھی شازیہ سے خلاصی کا ایک منصوبہ بنایا اور حتی الامکان اپنے معاشقے کو سلیقے سے ختم کرنے کی ٹھانی۔

چنانچہ جس روز نیلوفر سوات کو روانہ ہوئی' جاوید' تانگہ اور نازنین کو اپنے فلیٹ پر لے آیا اور اُسی روز ریستوران میں چائے پر مدعو کر لیا۔ شازیہ خوب بن ٹھن کر آئی اور خوب میٹھی میٹھی باتیں ہونے لگیں اور پھر جیسا کہ لڑکیوں کی عادت ہے' شازیہ نے کہا ''اگلے اتوار کو تو میری سالگرہ ہے''۔ اس پر جاوید نے مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''تو پھر آیئے نا' اس روز غریب خانے پر مل کر دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔'' اس پر شازیہ نے اشتیاق بھری ہاں کی۔ جاوید بولا ''خوب پھر تو میں سالگرہ پر ایک خوب صورت تحفہ بھی پیش کروں گا۔'' شازیہ کہنے لگی ''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟'' جاوید' بولا ''ضرورت ہے یا' نہیں میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں ایک یادگار تحفہ دوں......'' گویا جاوید نے ترکِ تعلق کی ابتدا بڑے سلیقے سے کر دی تھی کیونکہ اگلے اتوار تو اس نے پھوپھی رفعت کے ہاں پشاور جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا' چنانچہ اسے یقین تھا کہ جب اگلے روز

شازیہ آئے گی اور اس کا ملازم بوٹا خاں اسے اپنے مالک کی غیر حاضری کے ضمن میں پھوپھی رفعت کی اچانک علالت کا افسانہ سنائے گا تو بی بی شازیہ اپنی محبت کی بساط لپیٹ کر رخصت ہو جائے گی۔ نہ ظہرانے کی ضرورت ہوگی' نہ تحفے کا تکلف کرنا پڑے گا۔

چائے ختم ہوئی تو جاوید سیدھا گھر آیا۔ ٹائیگر کو باہر پارک میں لے جا کر ایک دو دوڑیں لگوائیں اور پھر کمرے کے اندر نازنین کو تین چار پراوزیں کرائیں اور پھر اللہ تعالٰی کے لطف و کرم کا اعتراف کرتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔ حالات عین منصوبے کے تحت چل رہے تھے۔

اگلی صبح خوب مزے کی دھوپ نکلی۔ جاوید نے سوچا کیوں نہ نازنین کا پنجرہ کھڑکی کی سل پر مدھم دھوپ میں رکھ دیا جائے کہ اس کے رگ و پے میں خون کی تیز اور گرم رو دوڑنے لگے' چنانچہ اس نے پنجرہ کھڑکی میں رکھا اور خود ٹائیگر کو لے کر باہر سیر کو چل دیا۔ جب واپس آیا تو نیلوفر کی فرمائشیں پوری کرنے پر اسے ایک عجیب اطمینان اور سکون محسوس ہوا۔ اُدھر نازنین صبح کی مدھم دھوپ میں خوشی سے ناچ گا رہی تھی۔ اِدھر ٹائیگر ایک ولولہ انگیز سیر کے بعد صوفے کے نیچے محوِ خواب تھا۔ جاوید نے اپنے خادم بوٹا خاں کو اپنا پسندیدہ مشروب لانے کو کہا اور پھر کرسی پر نیم دراز ہو کر جرعہ جرعہ پینے لگا۔ تا آنکہ بوٹا خان نے اطلاع دی:

''حضور' باہر ایک ملاقاتی تشریف لائے ہیں۔ اسم مبارک دھمن خان دھگڑا بتاتے ہیں۔''

جاوید نے اپنے ذہن کے سب کونوں میں جھانکا۔ کوئی ایسا نام وہاں محفوظ نہ تھا۔ بہر حال اس نے اپنا گلاس میز پر رکھا اور اجنبی کے استقبال کے لئے' ایک عجیب سرگرانی کے عالم میں اٹھا کیونکہ اس شخص کو دیکھنا یا جاننا تو درکنار' ایسا کرخت نام ہی کبھی نہیں سنا تھا اور جناب دھگڑا کچھ اس قسم کی مخلوق تھے جنہیں ایک دفعہ دیکھنے کے بعد بھلانا ممکن نہ تھا۔ قدرت نے ان کی شناخت بڑے وسیع پیمانے پر کی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ان کے آنے سے پورا کمرہ روشندانوں تک بھر گیا ہو۔ کمرے میں ان سے پہلے ان کی مونچھ داخل ہوئی، پیچھے خود تھے۔ پھولے ہوئے نتھنے اور چیرتی ہوئی آنکھیں جیسے غصیل سارجنٹ میجر یا ہیڈ کانسٹیبل کی ہوتی ہیں۔ بہر حال جاوید نے اپنا سکون

قائم رکھا اور بولا:

''آیئے جناب تشریف لائیے۔''

لیکن جواب میں دشمن خان دھگڑا نے جاوید کے سراپے پر ایک ایسی نگاہ دوڑائی جو غضبناک بھی کہی جاسکتی ہے اور حقارت آمیز بھی، جیسے آپ کو سلاد کی پلیٹ میں کوئی کیڑا ابھرتا نظر آجائے۔ بولا:

''تو تم ہو جاوید اعوان؟''

''جی، بالکل!''

''میں دشمن خان دھگڑا ہوں۔''

''جی ہاں، میں آپ کا اسمِ گرامی ابھی بوٹا خان کی زبانی سن چکا ہوں۔''

''میں سامنے کے مکان میں رہتا ہوں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے امید ہے آپ خیریت سے ہیں۔''

''خیریت سے تھا، مگر اب نہیں ہوں۔''

''اللہ خیر کرے۔''

''یوں تو میری زندگی خاصی پُرسکون ہے، مگر آج ایک منظر نے میرا سکون برباد کردیا اور میرا خون کھولا کر رکھ دیا۔''

''اوہو، خون کا کھولنا تو بڑی نامراد علامت ہے مگر اس کھولاہٹ کا باعث؟''

''بتاتا ہوں، ذرا سنو! چند لمحے پیشتر میں کھڑکی کے قریب بیٹھا اپنی تقریر تیار کررہا تھا جو بحیثیت نائب صدر میں نے انسدادِ بے رحمیِ حیوانات کے سالانہ جلسے میں کرنی ہے لیکن اتفاقاً کاغذ سے آنکھ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے کے مکان میں ایک ظالم نے ایک ننھے سے پرندے کو شدید عذاب میں مبتلا کررکھا ہے۔ ایک لمحے کے لئے میں نے یہ اذیت ناک منظر دیکھا اور میرا خون جمنے لگا۔

''آپ نے فرمایا تھا کھولنے لگا تھا۔''

''پہلے کھولا' پھر ٹھنڈا ہوا۔ کیا بتاؤں مجھے اس شیطان پر کس قدر غصہ آیا۔''

بالکل غصہ آنا چاہئے تھا۔ کون تھا یہ شیطان بھلا؟

دھگڑا نے آنکھوں کے حلقے تنگ کرتے ہوئے' دانت بھینچتے ہوئے اور اپنی کیلے جیسی انگلی تقریباً جاوید کے چہرے میں چبھوتے ہوئے کہا:

''یہ شیطان تم ہو' تم۔ جاوید اعوان!''

''کیا کہہ رہے ہیں مسٹر جھگڑا؟''

''جھگڑا نہیں' دھگڑا''

''ایک ہی بات ہے چلیں دھگڑا ہی۔''

''میں کہہ رہا تھا یہ تم تھے ایک غریب' بے کس چڑیا کو نذر آتش کرنے والے میں پوچھتا ہوں تم نے اس غریب کا پنجرہ اس جلتی دھوپ میں کیوں رکھا؟ فرض کرو تمہیں اس دہکتی زمین پر ننگے پاؤں' ننگے سر کھڑا کر کے بھون دیا جائے' تو؟''

یہ کہہ کر دھگڑا نے کھڑکی سے نازنین کا پنجرہ اٹھایا اور سائے میں رکھتے ہوئے جاوید سے بولا۔

''یہ تم جیسے موذی لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں ان غریب بے زبانوں کے لئے انجمن قائم کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

جاوید صلح کے انداز میں بولا

''میرے خیال میں تو نازنین اپنے پنجرے میں صبح کی ہلکی دھوپ کا لطف اٹھا رہی تھی۔''

جواب میں دھگڑا نے ایک آتشیں سانس لیا مگر بولنے سے اجتناب کیا ادھر جاوید نے صلح جوئی کی پالیسی جاری رکھتے ہوئے کہا:

''آپ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا؟''

''میں کچھ نہیں پیوں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔ باقی رہا نازنین کا معاملہ تو میں ضرور کہوں گا کہ مسٹر دھگڑا آپ انصاف سے کام نہیں لے رہے شاید مجھ سے غلطی ہو گئی ہو، لیکن میری نیت نیک تھی۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہو میرا تو یہ خیال تھا کہ مدھم دھوپ کی گدگداہٹ نازنین کو بڑی موافق آئے گی۔''

''بکواس۔'' دھگڑا نے مختصراً مگر زور سے کہا۔

اور عین اسی لمحہ صوفے کے نیچے سے ٹائیگر چونک کر اٹھا اور جونہی اس کی نگاہ، جاوید کے مانوس چہرے کی بجائے دھگڑا کی کالی گھنا سی مونچھ پر پڑی، غریب ڈر کے مارے چیختا چلا تا پھر صوفے کے نیچے گھس گیا۔ مگر دھگڑا نے اس واقعہ کو بھی عجیب رنگ دیا اور بولا:

''تو یہ بات ہے! یہ معصوم چڑیا ہی تمہارے ستم کا نشانہ نہیں۔ ایک غریب کتا بھی تمہاری سنگدلی کا شکار ہے ذرا دیکھو کس طرح تمہیں دیکھتے ہی روتے کراہتے دبک کر بیٹھ گیا۔''

جاوید نے آرام سے کہا:

''مسٹر دھگڑا میرا خیال نہیں کتے کو میری شکل پر اعتراض ہے بلکہ ہم دونوں کے تو بڑے دوستانہ باہمی تعلقات ہیں۔''

''تو پھر کیا وجہ ہے کہ تمہیں دیکھتے ہی اس نے اس قدر فلک شگاف چیخ بلند کی؟''

''مسٹر دھگڑا۔ اگر آپ سچ پوچھنا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ آپ کی مونچھ ہے۔''

اس پر دھگڑا نے اپنی آستینیں چڑھانا شروع کیں اور کہا:

''تو کیا سچ مچ تم میری مونچھ پر تنقید کی جرأت کر رہے ہو؟''

''نہیں دھگڑا صاحب، میں کتے کی بات کر رہا ہوں۔ میں تو ذاتی طور پر آپ کی مونچھ کا بڑا مداح ہوں۔''

''سچ''؟

''سو فیصد سچ۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، میں سمجھا تم میری مونچھ کا مذاق اڑا رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری دادی اماں میری مونچھ کو پنڈی کی حسین ترین مونچھ سمجھتی ہے۔ شاید تم تو میری دادی کو بے وقوف بڑھیا سمجھتے ہوگے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں مسٹر ڈھنگرا؟ دادیاں سب قابل احترام ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی بھی۔''

''شکریہ، تم ایسا سمجھتے ہو۔ ورنہ تم آج تیسرے آدمی ہوتے جن کا میں نے اپنی دادی کی شان میں گستاخی کرنے پر قیمہ کیا ہوتا یا شاید چوتھے آدمی، مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ ڈائری دیکھ کر تمہیں صحیح تعداد بتا سکتا ہوں۔''

''اس زحمت کی ضرورت نہیں مجھے آپ کی یادداشت پر اعتبار ہے۔''

چند لمحوں کے لئے گفتگو تھمی۔ آخر ڈھنگرا بولا:

''تو ٹھیک ہے مسٹر اب میں جاتا ہوں لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ دیکھتے ہو نا یہ نوٹ بک جو میرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں میں بے زبان پرندوں اور حیوانات کو ستانے والوں کی فہرست رکھتا ہوں اور انجمن ان تمام شیطانوں پر آنکھ رکھتی ہے۔ ذرا تم بھی اپنے کوائف لکھوا دو۔''

''پوچھیں!''

''تمہارا نام؟''

''جاوید اعوان''

''عمر؟''

''چوبیس سال''

''قد؟''

''چھ فٹ''

''وزن؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے ایک من پینتیس سیر تھا اب ذرا ہلکا لگتا ہے۔''

''چلیں ایک من تیس سیر لکھ لیتے ہیں۔ اور جاوید اعوان آج کی کارروائی ختم سمجھو۔ بس تمہارا نام مشکوک لوگوں کی فہرست میں لکھ لیا گیا ہے جنہیں میں بغیر اطلاع کے ملنے جایا کرتا ہوں۔ سو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تمہارے دروازے پر میری اگلی دستک کب پڑے گی۔''

''آپ جب چاہیں قدم رنجہ فرمائیں'' جاوید مسکراتے ہوئے بولا۔ اس پر دھگڑا نے کسی قدر خوش کلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا:

''ہماری انجمن ایک خاصا معزز ادارہ ہے ہم کسی کو بے جا طور پر تنگ نہیں کرتے حتیٰ کہ پہلا جرم معاف بھی کر دیتے ہیں اور تنبیہ ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مگر دوسرے جرم پر سختی میں شدت آ جاتی ہے۔ کتنی شدت؟ یہ ہماری قواعد کی کتاب میں رقم ہے اور اس کا ایک نسخہ میں گھر جاتے ہی تمہیں بھیج دوں گا۔ اس میں تم شیخ شوری کی مثال پڑھ لینا۔ اُس کم بخت نے اپنی بلی پر سالن کی پلیٹ الٹ دی تھی اور پھر اسے ہمارے ہاتھوں ایک خوفناک الٹ پلٹ سے گزرنا پڑا تھا''۔

یہ کہہ کر دھگڑا کسی رخصتی سلام کے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ میرا بھتیجا' جاوید' عجیب بے پروا سا نوجوان ہے۔ اس کی دھگڑا سے مڈبھیڑ جمعرات کو ہوئی تھی۔ جمعہ کی دوپہر تک وہ سب کچھ بھول چکا تھا اور ہفتے کو جاوید وہی زندہ دل اور خوش باش لونڈا تھا کہ جو تھا اور اسی ہفتے کے روز' آپ کو یاد ہوگا' اسے اپنی پھپھو کو ملنے پشاور جانا تھا۔ اب پشاور کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں نوجوانوں کے لئے کوئی کشش ہو لیکن جاوید کے لئے پشاور مقناطیس کی سی کشش رکھتا تھا اور یہ مقناطیس تھی اس کی پھوپھی رفعت جس کے پاس لاکھوں کی جائیداد تھی اور جس کو دل کے دو دورے ماہانہ پڑتے تھے۔ اور جاوید ان دوروں کے درمیان پھوپھی کے بیمار دل میں گھر کرنا چاہتا تھا۔ سو جہاں اسے پھوپھی کی خوشنودی کی خوشگوار توقعات تھیں وہاں اس امکان سے بھی مطمئن تھا کہ کل اتوار کو جب شازیہ میرے فلیٹ پر آئے گی تو مجھے غیر حاضر پا کر مایوس و نامراد واپس چلی جائے گی اور پھر میں ہوں گا

اور میری محبوبہ نیلوفر...... جوانی کی راتیں مرادوں کے دن!

چنانچہ جب اس کا ملازم بوٹا خان اس کا سامان کار میں رکھ رہا تھا تو جاوید میاں فلمی دھنیں گنگناتے مستقبل کی مسرتوں میں لوٹ پوٹ پھرتے تھے۔ یہ سامان رکھا جا چکا تو جاوید نے بوٹا خان سے پوچھا:

''تو سمجھ لیا، بوٹا خان، میری غیر حاضری میں کیا کچھ کرنا ہے؟''

''جی حضور''

''ٹائیگر کو روزانہ سیر کرانا ہے؟''

''جی ہاں''

''نازنین کو کمرے میں پرواز کرانا ہے''

''جی ہاں''

''کہیں الٹ نہ کر بیٹھنا، یعنی ٹائیگر کو پرواز کرانے لگو اور نازین کو سیر پر لے جاؤ۔''

''نہیں سر، ایسا نہیں ہوگا۔''

اور آخر میں ایک ضروری بات۔ کل ایک نوجوان خاتون ہمارے گھر لنچ پر مدعو ہیں وہ آئیں تو انہیں باادب بتانا کہ مجھے ایک ناگزیر وجہ سے پھوپھی جان کے پاس جانا پڑ گیا ہے اور غیر حاضری کی معافی چاہتا ہوں ویسے اگر وہ کوئی چیز مانگیں یا چاہیں تو بخوشی دے دینا۔

''بہت اچھا جناب''

جاوید پشاور پہنچا تو پھوپھو کو انتظار کرتے پایا۔ بڑے ادب سے سلام کیا پھوپھو نے اسے بازوؤں سے تھام کر اس کی پیشانی چومی۔ پھر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھر تاش کھیلنے لگے پھوپھو کی بلی چاندنی جاوید کے پاس آ بیٹھی، جاوید میز پر تاش کا پتہ رکھ چکتا تو پھر اسی ہاتھ سے بلی کا بایاں کان گدگداتا۔ توقع یہ کہ یہ گدگدی براہ راست پھوپھو کا دل گدگدائے گی۔ جاوید دو روز پشاور ہی میں ٹھہرا اور پیر کو راولپنڈی کے لئے رخصت کا طالب ہوا۔ رفعت پھوپھی نے وفور محبت سے اپنے

بھتیجے کے رخسار پر بوسہ دیا، بے شمار دعائیں دیں اور ہدایت کی کہ کار آہستہ چلانا اور ایک بار پھر یاد دلاتے ہوئے کہا" میں اگلے جمعے لاہور جاتے ہوئے پنڈی سے گزروں گی۔ چائے پلاؤ گے نا؟"

"بہ دل و جان، پھوپھو۔ میری تو سب سے بڑی حسرت ہی یہی ہے کہ کبھی آپ تواضع کا موقع دیں۔ بہر حال جمعہ کو چشم براہ ہوں گا۔"

جاوید کار میں بیٹھا تو کار چلا نہیں رہا تھا، خوشی سے اڑ رہا تھا۔ اسے جتنے لایعنی گانے یاد تھے یکے بعد دیگرے گانے لگا۔ گھر پہنچا تو بوٹا خان دروازے پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھا تو اسی خوشی کے ریلے میں بولا:

"بوٹا خان! اسلام علیکم و برکاتہ"

بوٹا خان اس تفصیلی سلام پر حیران تو ہوا مگر بصد شکر مالک کے سلام کا جواب دیا۔

"وعلیکم، سر۔ معلوم ہوتا ہے اس دفعہ آپ کی سیر پُر لطف رہی"

"کچھ پُر لطف؟ پُر بہار کہو فرحت بخش، نشاط انگیز! تم سناؤ یہاں سب ٹھیک ہے"؟

"جی ہاں"

"ہمارے دو بے زبان دوست کیسے ہیں؟"

"سر، جہاں تک نازین کا تعلق ہے، مسلسل پروازوں سے صحت کی تصویر بنی بیٹھی ہے۔"

"خوب، اور ٹائیگر؟"

"سر ٹائیگر کے متعلق کچھ وثوق سے کہنا مشکل ہے کیونکہ آپ کی لنچ کی مہمان مس شازیہ کل ٹائیگر کو اپنے ساتھ لے گئی؟"

یہ سنا تو جاوید کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس نے قریبی دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"ساتھ لے گئی؟"

"جی سر۔ آپ نے حکم دیا تھا کہ خاتون جو چیز مانگے، پیش کر دینا اس نے ٹائیگر کا انتخاب

کیا اور آپ کو یہ پیغام دینے کو کہا کہ افسوس ہے آپ سے ملاقات نہ ہو سکی مگر ظاہر ہے کہ آپ پھوپھی جان کو مایوس نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کو مجھے سالگرہ کا تحفہ دینے پر اصرار تھا میں نے ٹائیگر چن لیا ہے اور اسے ساتھ لے جا رہی ہوں...... شکریہ۔''

جاوید نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔ نوکر سے خفا ہونا بے سود تھا کہ اس نے تو اپنے صاحب کی لفظاً تعمیل کی تھی اور جاوید کو علم تھا کہ بوٹا خان ہمیشہ حکم کے ہجے کر کے اس پر عمل کرتا ہے۔ آخر بوٹا خان سے کہنے لگا:

''بوٹا خان! یوں کرو مس شازیہ کو فون کرو میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ناممکن سر'' بوٹا خان نے فیصلہ کن جواب دیا۔

''ناممکن کیوں''؟

''اس لئے کہ جانے سے پہلے مس شازیہ نے فرمایا تھا کہ میں آج سہ پہر کی بس سے سوات جا رہی ہوں اور پھر یہ بھی فرمایا کہ اپنے صاحب کو بھی مطلع کر دینا۔''

''تو پھر بوٹا خان' مجھے دو گولیاں اسپرین کی لا دو۔''

''بوٹا خان فی الفور اسپرین کی جوڑی لے آیا جو جاوید نے پانی کے بغیر ہی نگل لی۔ کوئی افاقہ محسوس نہ ہوا۔ اور بولا:

''بوٹا خان' دیکھو اور توجہ سے سنو! ہمیں بڑی سوچ سمجھ سے قدم اٹھانا ہے' بے حد سوچ سمجھ سے۔''

''بالکل جناب!''

اس پر جاوید نے بوٹا خان کو واقعہ کی تفصیلات اور نزاکت سے آگاہ کیا۔ بوٹا خان کے منہ سے پریشانی میں چچ چچ نکلا۔ جاوید بولا:

''چچ چچ کا کوئی فائدہ نہیں' بوٹا خان یہ تدبیر کا مقام ہے۔ تدبیر اس بات کی کہ نیلوفر کو کتے کی گمشدگی کی کیا وجہ بتائی جائے۔''

بوٹا خان نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کیں اور تدبیر ڈھونڈ لایا۔

''سر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ خاتون کو بتائیں کہ سیر کے دوران اچانک ٹائیگر نے ایک آوارہ بلی کو دیکھ کر گلے سے پٹہ اتار پھینکا اور بلی کے پیچھے غائب ہو گیا۔''

''ٹھیک ہے' بوٹا خان مگر بہتر ہوگا کہ کتا میرے ہاتھ کی بجائے تمہارے ہاتھ سے پٹہ تڑوا کر نکل بھاگے۔''

''ایسا ہی سہی' سر''

''بوٹا خان' تم بے شک وفادار انسان ہو۔ اب تدبیر پر قائم رہنا اور اس انعام کا مستحق ثابت ہونا جو میرے ذہن میں ہے۔''

''بہت اچھا حضور''۔

دیکھو نا' جب مس نیلوفر واپس آئے گی تو ظاہر ہے مجھے کتے کی گمشدگی پر تمہیں خاصی روانی سے لعنت ملامت کرنا پڑے گی اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ محض ڈرامہ ہوگا اور ڈرامے کی گالیاں ذاتی نہیں ہوتیں۔

''جی ہاں' میں سمجھتا ہوں''۔

''اچھا' یہ مسئلہ تو کچھ سلجھ ہی گیا ہے۔ باقی صرف ایک بات ہے کہ جمعے کے روز پھوپھی رفعت چائے پر تشریف لا رہی ہیں''۔

''سر' میں خدمت کو حاضر ہوں''۔

بوٹا خان سے فارغ ہو کر' جاوید نے نیلوفر کو خط لکھنا شروع کیا

جانِ من السلام علیکم۔

میں نے ٹائیگر اور نازین کے ساتھ چند نہایت ہی پُر لطف دن گزارے ہیں، خصوصاً ٹائیگر کے ساتھ ہر روز کی طویل اور صحت افزا سیر کی بدولت۔ فقط کل زکام کی وجہ سے میری طبیعت ناساز تھی۔ ڈاکٹر نے بزور بستر کے سپرد کر دیا اور بصد مجبوری مجھے ٹائیگر کو سیر کے لئے بوٹا خان کے

حوالے کرنا پڑا۔ بوٹا' جیسا کہ تم جانتی ہو' بے حد قابلِ اعتبار اور وفادار ملازم ہے مجھے تو خیر ٹائیگر پیارا لگتا ہی ہے لیکن یہ دراصل میری اور بوٹا خان کی مشترکہ محنت اور محبت کا نتیجہ ہے کہ ٹائیگر کی صحت میں ایک قابلِ رشک تبدیلی آئی ہے۔ غالباً اسی صحت' طاقت اور توانائی کا نتیجہ تھا کہ کل سیر کے دوران ٹائیگر نے کوئی بلی دیکھی یا چوہا' بوٹا خان کے ہاتھ سے پٹہ تڑا کر اپنے شکار کے پیچھے لپکا اور اس تیزی سے نظروں سے غائب ہوا کہ دوبارہ...... میں کس منہ سے کہوں؟...... نظر نہ آیا۔ بوٹا خان جب یہ قیامت خیز خبر لایا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اب تک نہیں سوکھے۔

نیلوفر ڈیئر! میں ہمیشہ ان شاموں کو یاد رکھوں گا جب ٹائیگر اور میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھے آگ سینکتے تھے' میرے ہاتھ میں کتاب ہوتی تھی اور ٹائیگر کسی نامعلوم مراقبے میں غرق' قالین پر دراز ہوتا تھا یہ نظارہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو آنسوؤں کی جھڑی اور تیز ہو جاتی ہے معاف کرنا جانم! شاید یہ سطور گیلی ہو جانے کی وجہ سے پڑھی نہ جا سکیں بخدا مجھے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں' اور کیا لکھوں؟

صرف تمہارا جاوید

جاوید نے خط تو لکھ دیا لیکن اس کا دماغی سکون بدستور ڈانواں ڈول تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت بپھر جائے تو الزامات کا طوفان بپا کر دیتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ ہر چند کہ نیلوفر کے طوفان کا بڑا ریلا بوٹا خان کے سر پر سے ہی گزرنا تھا تاہم اس کے اضافی تھپیڑے اسے بھی شرابور کر دیں گے۔ پھر نیلوفر اگرچہ ماہ پیکر بھی تھی اور گل اندام بھی' تاہم طیش میں آ جانے پر وہ یکسر تیغ بے نیام تھی۔ جاوید کو وہ شام خاص طور پر یاد تھی جب اسے سینما لے گیا اور وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ٹکٹ گھر چھوڑ آیا ہے اس وقت کوئی نو آموز قصاب موجود ہوتا تو اسے پتہ چلتا کہ صرف دو منٹ میں ایک شخص کی کھال کیسے اتاری جاتی ہے۔

چنانچہ جاوید اپنی ایک ذہنی لغزش...... شازیہ کو تحفہ دینے...... کے متعلق سوچتا تو کانپ اٹھتا۔ اس نے کئی شب و روز گہری سوچوں میں ڈوب کر گزارے۔ کلب جاتا تو دوست کچھ کہتے' وہ

کچھ جواب دیتا بلکہ کچھ جواب ہی نہ دیتا۔ وہ جو کبھی رونقِ محفل تھا اب ایک اذیت ناک بور لگنے لگا تھا۔ خاموش، گم سُم، بے زبان بلکہ بے جان۔ لیکن ایک روز جب وہ کلب میں بیٹھے اونگھ رہا تھا، اچانک اس نے سر اٹھایا اور اس کی نگاہ سامنے لٹکتے ہوئے تاریخ اور دن کے کارڈ پر پڑی، یک لخت اس کے اندر کوئی بٹن دب گیا۔ بجلی کی تیزی سے اٹھا، بھاگا اور باہر آ کر کار سٹارٹ کی......ہوا یہ تھا کہ اسے کارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا تھا کہ اس روز جمعہ تھا۔ یعنی وہی جمعہ جس روز ساڑھے چار بجے پھوپھی رفعت نے چائے پر آنا تھا۔ ساڑھے چار بجنے میں ایک آدھ سیکنڈ باقی تھا کہ وہ گھر میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر کہ ابھی پھوپھی جان نہیں پہنچیں، خدا کا شکر ادا کیا۔

کمرہ دیکھا تو میز لگی ہوئی تھی لیکن ماکولات سے خالی تھی۔ فقط ایک طرف نازنین پنجرے میں مدھم سروں میں گنگنا رہی تھی۔ جاوید نے آہستہ سے نازنین کا پنجرہ کھولا۔ نازنین پھدک کر باہر نکلی اور لگی کمرے کے ہوائی چکر لگانے۔ عین اسی وقت بوٹا خان ماکولات سے بھری ٹرے اٹھائے داخل ہوا، اور بولا

''سر یہ آلو اور پالک کے پکوڑے ہیں۔ خواتین ان پر جان دیتی ہیں۔''

جاوید نے اثبات میں سر ہلایا اسے یاد آیا کہ پچھلی دفعہ پھوپھی رفعت پکوڑوں پر بھوکے بھیڑیے کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔ جاوید کو اچانک یاد آیا: ابھی تک پھوپھی نہیں پہنچی۔ بوٹا خان سے پوچھا:

''بوٹا خان، کیا وجہ ہے پھوپھی جان نہیں پہنچیں؟''

''سر، وہ تو پہنچ چکی ہیں۔ یہ دیکھیں ان کا سوٹ کیس پڑا ہے صرف تھوڑی دیر کے لئے ساتھ کے تار گھر میں تار دینے گئی ہیں آتی ہی ہوں گی''

''بہت خوب''

''سر، اب یہ بتائیں کہ دودھ کی ضرورت ہوگی یا ملائی لے آؤں؟ ویسے میں نے ایک فالتو پرچ میز پر رکھ دی ہے''

جاوید کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ حیرانی سے بولا:

''بوٹا خان' تمہاری عقل تو ٹھکانے ہے؟ دودھ' ملائی' پرچ؟ یہ سب کس لئے؟ پھوپھی کی عمر تو ملائیاں کھانے کی نہیں''

''پھوپھی صاحبہ کے لئے نہیں' سر۔ ان کی بلی کے لئے۔ وہ اپنی بلی چاندنی بھی ساتھ لائی ہیں''

''اچھا تو چاندنی بھی ہماری مہمان ہیں؟''

''جناب''

''تو اسے دودھ پلاؤ یا ملائی کھلاؤ۔ کچھ فرق نہیں پڑتا مگر اسے جو کچھ دو کچن میں دو' کھانے کی میز پر نہیں''۔

''لیکن چاندنی اس وقت کچن میں تو نہیں''

'' کچن میں نہیں تو میرے بیڈروم میں ہوگی۔ وہیں کھلا دو''

''مگر سر چاندنی تو اسی کمرے میں ہے جہاں نازنین بھی محوِ پرواز ہے''

عین اسی لمحے جاوید نے دیکھا کہ کوئی گربہ نما میزائل نازنین کے تعاقب میں ہے۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا''اوخدایا' مارے گئے''

ادھر باہر سے کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی اور بوٹا خان دروازہ کھولنے کو دوڑا مگر جاوید بدستور پھوپھی کی بلی کی نیت سے ایک وحشت کے عالم میں تھا۔ کیونکہ اسے اب بھی موہوم سی امید تھی کہ نیلوفر ٹائیگر کے گم ہو جانے سے خواہ کتنی ہی ناراض ہو' نازنین کی صحت وسلامتی سے کافی تلافی ہو سکے گی اور وہ کسی قدر بیباکی سے کہہ سکے گا کہ''مس نیلوفر ٹائیگر کے معاملے میں میں قصور وار سہی' لیکن ذرا ایک نگاہ نازنین پر ڈالو۔ ہے نا صحت اور حسن کی تصویر؟ یہ میری محبت اور پیار کا نتیجہ ہے۔ ذرا اس کی اڑان دیکھو' اس کا نغمہ سنو......'' ......لیکن اگر خدانخواستہ نازنین' پھوپھو کی بلی چاندنی کا ڈنر بن گئی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔''

ادھر بلّی کے جارحانہ انداز سے واضح تھا کہ یہ سانحہ اب کسی لمحہ وقوع پذیر ہونے والا ہے پھوپھی کی بلی چڑیا کے ساتھ بالکل اسی سلوک پر تلی ہوئی تھی جو سلوک پھوپھی پکوڑوں کے ساتھ کرتی تھی۔ اب کواڑ کی آڑ میں نازنین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اور اس کی کھڑی دم کے سرے میں بل پر بل آرہے تھے اور اگلے لمحے میں جاوید کا تو دم ہی نکل گیا کہ اس کے دیکھتے دیکھتے بلّی نے انتہائی پھرتی سے چڑیا کو دبوچنے کے لئے چھلانگ لگائی لیکن نازنین ایسا تر نوالہ نہ تھی۔ بڑے سکون سے ذرا بائیں جانب سرک گئی اور بلّی کا وار پوری ایک بالشت سے خطا گیا۔ یعنی ایک بالشت آگے دیوار سے جاٹکرائی اور نازنین نے اسے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے تمسخرانہ چہچہا دیا گویا کہتی ہو" بیوقوف بلّی"

اب نازنین کی خود اعتمادی اپنی جگہ مگر جاوید فکر سے گھل رہا تھا کیا خبر، چاندنی کا اگلا وار کاری ثابت ہو۔ چنانچہ چاندنی کی روشنی گل کرنے کے لئے جاوید نے ادھر اُدھر گولہ بارود کے لئے نگاہ دوڑائی۔ معاً اسے میز پر پکوڑوں کی پلیٹ نظر آئی۔ اس نے دونوں ہاتھ پکوڑوں سے بھر لئے اور ان نمکین کارتوسوں سے چاندنی کے جسم و جان کا نشانہ لینے لگا۔ ایک دو گولیاں نشانے پر بیٹھیں بھی۔ لیکن چاندنی کی توجہ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ موقع پا کر چاندنی نے نازنین کی سمت میں ایک اور جست لگائی مگر نازنین حسب سابق دو قدم دائیں طرف ہٹ گئی اور بلّی نے ایک بار پھر منہ کی کھائی۔ مگر فی الفور سنبھلی اور نازنین کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اب بے صبری کے عالم میں جاوید نے دوسری پلیٹ سے سلطانہ کیک اٹھا کر دے مارا۔ وہ خطا گیا تو ایک کلچے سے شست باندھی مگر بلّی کی صحت پر کوئی مضر اثر نہ ہوا' آخر جاوید کے ذہن میں ایک چال آئی جو پہلے ہی آنا چاہئے تھی۔ اس نے میز سے میز پوش کھینچا اور بلی کے پیچھے جا کر کمال تیزی سے اس پر ڈال دیا اور پھر بلّی اور میز پوش کے ملغوبے کو بل دے کر ایک صاف ستھرا پارسل بنا کر ہاتھ میں لٹکا لیا۔ جاوید اپنی کامیابی پر نازاں تھا۔ اسے کبڈی یا فٹ بال کھیلے عرصہ ہوا مگر جس پھرتی 'جس ذہانت اور جس ہنر مندی سے اس نے بلّی کو مسخر کیا تھا' ایک کارنامے سے کم نہ تھا۔ بیشک تھیلے سے شدید احتجاجی جھٹکے برآمد

ہور ہے تھے لیکن جاوید نے انہیں نظرانداز کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چاندنی کو اپنی بے راہ روی کا احساس ہوگا اور آخر چپ ہو جائے گی۔ چنانچہ میز پوش کو منہ کے قریب لا کر وہ مقید چاندنی کو ایک ناصحانہ لیکچر پلانے کو تھا کہ کیا دیکھتا ہے: سامنے ایک نہیں' دو نہیں' پوری تین چار جانی پہچانی ہستیاں کھڑی ہیں' پھوپھی رفعت' مس نیلوفر اور یادش بخیر میاں دھگڑا۔

ادھر بوٹا خان' باادب' باملاحظہ عرض پرداز ہوا۔ ''خواتین و حضرات چائے تیار ہے اور میز پر رکھ دی ہے''۔

جاوید نے تین مہمانوں کو دیکھا تو اس کے منہ سے ایک خاموش چیخ برآمد ہوئی اور اس کے ہاتھ سے میز پوش کا پارسل گر پڑا۔ چاندنی سر کے بل گرنے کے بعد بھاگی اور غریب نے پردے کے پیچھے جا پناہ لی۔ خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ چھا گیا جس میں جاوید کے سر سے قیامت گزر گئی۔ غریب کے منہ میں زبان تھی لیکن کوئی لفظ نہ تھا۔ اس خاموشی کو دھگڑا نے توڑا اور دانت پیستے ہوئے جاوید سے مخاطب ہوا:

''تو تم اپنی پرانی کرتوتوں سے باز نہیں آئے' اعوان کے بچے!''

پھوپھی رفعت نے بھی منہ کے ایک کونے سے جھاگ بہاتے ہوئے کہا

''اس ظالم نے میری چاندنی کو پکوڑوں سے پیٹا ہے۔''

''جی ہاں' محترمہ'' دھگڑا بولا۔ ''میں نے یہ ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھا۔''

''اور اس نے میری بلی پر سلطانہ کیک اور کلچوں سے بھی حملہ کیا۔'' پھوپھو نے جاوید کو قصابانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مزید الزام لگایا۔

بوٹا خان حسب معمول شوقِ تواضع میں گویا ہوا ''خواتین و حضرات' میں ابھی تازہ سلطانہ کیک اور کلچے لایا ہوں۔''

''خدارا سنیے!'' سہمے ہوئے جاوید نے کھڑکی کی طرف پیچھے ہٹتے ہوئے کہا میں ہر بات کی صفائی پیش کر سکتا ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں صفائی وفائی کی'' دھگڑا نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا سارا واقعہ ہمارا چشم دید ہے۔''

ادھر پھوپھی رفعت جو اپنی پیاری بلی چاندنی کی حالت دیکھ کر بے حال ہو رہی تھی' بونا خان سے کہنے لگی' بتاؤ ٹیلیفون کہاں ہے۔ میں اپنے وکیل کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اس نالائق بھتیجے کو اپنی جائیداد سے عاق کر دیا ہے۔''

پھر پھوپھی کا روئے سخن دھگڑا کی طرف تھا۔

''دیکھیں دھگڑا میاں۔ یہ شخص کسی رعایت کا مستحق نہیں۔ اس کی کوئی پسلی سلامت نہیں رہنا چاہئے''۔

'دھگڑا بولا' مادام' میں تو کب سے تیار کھڑا ہوں ۔ ذرا یہ نوجوان خاتون ایک طرف ہو جائے تو پھر میں جانوں اور اس نالائق کی جملہ پسلیاں۔''

بونا خان جو بدستور ٹی پارٹی کے موڈ میں تھا بولا'' کیا میں تازہ پکوڑے تیار کرلاؤں' سر؟''

''ٹھہرو' ٹھہرو'' نیلوفر چلائی جس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی۔

......دھگڑا فوراً رک گیا اور نیلوفر......جس کا پورا نام نیلوفر لطیف تھا......کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

''مس لطیف' میں محض چہرے کی مشابہت کی وجہ سے پوچھنا چاہتا ہوں'' کہ آپ میرے دوست جنرل لطیف کی رشتہ دار تو نہیں؟''

''وہ میرے چچا ہیں۔'' نیلوفر مختصراً بولی۔ اس پر دھگڑا حیرت سے بولے :''کتنی عجیب بات ہے پچھلی رات میں ان کے ساتھ ڈنر میں شریک تھا۔ بیشک یہ بہت چھوٹی دنیا ہے لیکن اتنی چھوٹی کہ اس میں اعوان جیسے گربہ کش اور میرے لئے بیک وقت جگہ نہیں۔ اس دنیا میں یا اعوان رہے گا' یا میں۔ چنانچہ مس نیلوفر اگر آپ کے دل میں اس شخص کے لئے رحم کی اپیل کا ارادہ ہے تو براہِ کرم یہ ارادہ بدل ڈالئے۔ ہماری انجمن کے نزدیک اس قسم کا رحم' ظلم کے مترادف ہے۔''

نیلوفر بے اختیار ہنس دی۔ کہنے لگی "دھگڑا صاحب! اس شخص کے لئے رحم! لاحول ولاقوۃ۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ پہلے تھپڑ کا ثواب میں خود حاصل کروں۔"

"تو یہ بات ہے؟" دھگڑا بولے۔ "کیا میں آپ کی وجہ عتاب پوچھ سکتا ہوں"؟

"ضرور" نیلوفر جاوید کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس شخص نے مجھ سے دغابازی کی ہے۔ میں اپنا کتا ٹائیگر اس کی حفاظت میں چھوڑ گئی اور اس نے وعدہ کیا کہ اس کی دل و جان سے دیکھ بھال کرے گا۔ مگر میرا اوجھل ہونا تھا کہ اس جھوٹے ہرجائی نے میرا کتا ایک معمولی سی عورت کو سالگرہ کے تحفے کے طور پر دے دیا"۔

جاوید کے منہ سے ایک اور الزام سننے پر ایک اور بے آواز چیخ نکلی اور وہ دانستہ یا ڈر کے مارے ایک قدم اور کھڑکی کی طرف ہٹ گیا۔ نیلوفر نے اپنا بیان جاری رکھا:

"میں سوات کی ایک سیر گاہ میں پھر رہی تھی کہ سامنے سے ایک عورت کتے کی رسی پکڑے آتی دکھائی دی۔ مجھے محسوس ہوا یہ کتا تو ٹائیگر کا ہم شکل لگتا ہے اور جب نزدیک آیا تو سچ مچ ٹائیگر ہی تھا۔" میں نے فوراً کہا:

"ارے بی بی! یہ میرے ٹائیگر کو کیوں لئے پھر رہی ہو؟"

وہ بولی" "تمہارا ٹائیگر؟ یہ تمہارا کب ہوا؟ یہ تو میرا کتا ہے جو میرے دوست جاوید اعوان نے مجھے سالگرہ کے تحفے کے طور پر دیا ہے"۔

میں نے یہ سنا تو گاڑی پکڑی اور سیدھی یہاں پہنچی کہ اس بے وفا کی تکہ بوٹی کر ڈالوں۔ اب اگر آپ نے مجھے روکا تو میں رو دوں گی اور وہ سچ مچ سسکیاں لینے لگی۔

یہ دیکھ کر پھوپھی رفعت اور دھگڑا میاں کی آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔

دھگڑا نے نیلوفر کے شانے کو پدرانہ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو مس نیلوفر یوں تو میں اپنے دوست کی بھتیجی کے لئے کیا کچھ نہ کروں گا مگر یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں مجھے بحیثیت نائب صدر انجمنِ انسدادِ بے رحمیِ حیوانات خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔

انجمن کے نزدیک یہ شرم کے علاوہ بزدلی کی بات ہوگی کہ میں خود تو کھڑا دیکھتا رہوں اور ایک بدمعاش کی گوشمالی کا کام ایک نازک بدن اور نوخیز دوشیزہ کے سپرد کر دوں''۔

نیلوفر بدستور سسکیوں کے درمیان بولی۔

''یہ تو ٹھیک ہے مگر میں سارے راستے اس ستمگر کو بسمل کرنے کی دل ہی دل میں مشق کرتی رہی۔ دیکھیں اسی غرض سے میں نے یہ وزنی چھاتہ خریدا ہے''۔

دھگڑا نے نیلوفر کا نازک ہتھیار دیکھا تو اپنی مسکراہٹ کو بمشکل روک سکا۔ بولا:

''مس نیلوفر۔ آپ زحمت نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ یہ کارِ خدمت مجھ پر ہی چھوڑ دیں''۔

بوٹا خان حسبِ معمول بولا: ''میں چند تازہ ٹوسٹ اور فروٹ چاٹ لے آؤں میڈم''؟

دھگڑا نے بوٹا خان کو خارج از بحث کرتے ہوئے بولنا جاری رکھا:

''اپنی تعریف کرنا میری عادت نہیں۔ جس شخص کی مس نیلوفر تکابوٹی کرنا چاہتی ہے میں انشاءاللہ اُس کا قیمہ کر دوں گا''۔

اس پر پھوپھی رفعت بھی پیار سے نیلوفر سے مخاطب ہوئی۔

''اب مان جاؤ' بیٹی۔ یہ کام دھگڑا میاں ہی انجام دیں تو اچھا ہے' مجھے تمہارے جذبات کا اندازہ ہے۔ خود میرے جذبات بھی کچھ اسی نوعیت کے ہیں مگر اس نئے دور میں بھی عورت پس منظر میں ہی رہے تو بہتر ہے۔ خصوصاً جہاں معاملہ مدِ مقابل کو ذرا باریک پیسنے کا ہو''

نیلوفر بے دلی سے بولی ''اچھا اگر یہی آپ کی مرضی ہے تو کریں بسم اللہ۔

اس پر پھوپھی رفعت نے نیلوفر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کے شانے کے اوپر سے دھگڑا کو اشارۃً بسم اللہ کرنے کو کہا۔ دھگڑا نے جاوید پر جلاّدانہ نظریں گاڑیں لیکن اتنے میں جاوید سرک سرک کر بالکل کھڑکی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ جونہی دھگڑا نے قدم بڑھایا' جاوید ایک لحاتی جست لگا کر کھڑکی میں جا بیٹھا۔ دراصل جب دھگڑا اور ہر دو خواتین جاوید کو سنا سنا کر اس کی بربادیوں کے مشورے کر رہی تھیں' جاوید نے راہِ فرار کا تعین کر لیا تھا۔ چنانچہ دھگڑا نے ایک

بلا کوانہ مُکا لہراتے ہوئے دوسرا قدم لیا تو جاوید نے اللہ کا نام اور بوٹا خان کی اوٹ لے کر کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی اور جب دیکھا کہ دونوں ٹانگیں سلامت ہیں تو کھلے میدان کو چیرتا دشمنوں سے دور نکل گیا۔

اسی رات جاوید بھیس بدلے اور نقلی مونچھ لگائے میرے کمرے میں داخل ہوا اور کوالا لمپور کا ٹکٹ مانگنے لگا۔ قصہ کوتاہ دو روز بعد جاوید ملیشیا میں تھا اور وہاں جا کر اپنے کام میں اس شوق سے بُت گیا کہ حکومت ملیشیا نے اسے پچھلے دنوں تنکو کے خطاب سے نوازا ہے۔ چنانچہ اس خط میں یہی خبر مسکراہٹوں کا باعث ہے۔

''مگر آپ نے قہقہہ بھی لگایا تھا'' قادر بولے'' اس کی شانِ نزول''؟

''جی ہاں'' انکل اکبر علی بولے'' جاوید نے آخر میں لکھا ہے کہ دوسری خوشخبری بھی ہے جو خط میں تو نہیں لکھوں گا مگر جب میں، بلکہ ہم وطن آئے تو آپ دیکھ کر میرے انتخاب کی داد دیں گے۔ مختصر یہ کہ یہاں کی لڑکیاں کتوں اور چڑیوں کی بالکل شوقین نہیں۔

# گراؤچو مارکس

ہالی وڈ کے فلمستان میں مارکس برادرس کا ڈنکا ایک عرصے تک بجتا رہا۔ ان پانچوں بھائیوں نے کامیڈی کی دنیا میں قابلِ رشک نام اور مقام پیدا کیا۔ ان بھائیوں میں سے ایک گراؤچو مارکس (Groucho Marx) تھا۔ گراؤچو نہ صرف مشہور اداکار تھا بلکہ وہ ایک مزاح نگار بھی تھا۔ اس کی کتاب "Groucho and Me" جو آج سے پچیس برس پہلے چھپی' امریکہ کے مزاحیہ ادب میں ایک قابلِ قدر تصنیف شمار ہوتی ہے۔ ذیل میں اس کتاب کے پہلے باب کا آزاد سا ترجمہ ہے جو گراؤچو نے کتاب کے دیباچے کے طور پر لکھا ہے:

ہر چند کہ لوگوں کو علم ہے تاہم میرے خیال میں یہ بتانے کا وقت آ گیا ہے کہ میری پیدائش بہت کم سنی کے عالم میں ہوئی تھی اور پیشتر اس کے کہ میں اپنی پیدائش پر پچھتا سکتا' میری عمر ساڑھے چار سال ہو چکی تھی۔ بہر حال اب عمر کا سوال اتنا اہم نہیں دراصل عمر ایسا دلچسپ موضوع ہی نہیں۔ کوئی بیوقوف بھی آہستہ آہستہ بڑا اور بوڑھا ہو سکتا ہے۔ بس روز بروز زندہ رہتے چلے جانے کی ضرورت ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ بعض اوقات اخبار ایسے بوڑھوں کی تصویریں کیوں چھاپ دیتے ہیں جنہوں نے زندگی کے سو سال پورے کر لئے ہوتے ہیں۔ ذرا یہ تصویر

---

"Grouche and Me" By Groucho Marks.

ملاحظہ ہو: بے چارے باباجی ایک خستہ سی شکل لئے بیٹھے ہیں اور ایک سو کی بجائے دو سو سال کے دکھائی دیتے ہیں اور یہی نہیں کہ اخبار والے محترم کی تصویر چھاپ کر نیچے نام لکھ دیں اور بس۔ وہ باباجی سے درازیِ عمر کے خفیہ رموز و اسرار بھی دریافت کر چکے ہیں اور انہیں باباجی کی تصویر کے نیچے درج بھی کر دیا ہے۔ ''جی'' میں سو سال کو پہنچا ہوں کیونکہ 1: میں نے کبھی سونے کے لئے گدا استعمال نہیں کیا۔ 2: ہر صبح نہار منہ پاؤ بھر بھوسی پھانکتا ہوں۔ 3: ہر روز بتیس گلاس پانی پیتا ہوں۔'' ............ ماشاءاللہ بتیس گلاس روزانہ! تو یہ باباجی ان لوگوں میں سے ہیں جو دنیا میں پانی کی قلت کے ذمہ دار ہیں۔ بے چارے سائنسدان سمندری پانی کا نمک زائل کر کے اسے پینے کے قابل بنا رہے ہیں کہ کئی ملکوں میں خلقِ خدا میٹھے پانی کے لئے ترس گئی ہے اور ادھر یہ بزرگ پورے ایک سو سال سے، بتیس گلاس روزانہ واحد گلے سے گزار رہے ہیں۔ جیسے اندر کسی تالاب میں ذخیرہ کر رہے ہوں۔ اگر ہماری طرح صرف آٹھ گلاس روزانہ پر گزارا کر لیتے تو ممکن ہے اس طرح عمرِ طبعی سے چند روز پہلے جاں بحق ہو جاتے مگر تین اور خدا کے بندے تو پیاس سے ہلکان نہ ہوتے رہتے۔

مجھے اب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنے ناشر کے دام میں کیسے آ گیا اور پھرتی سے یہ کتاب لکھ ڈالی۔ آپ کسی کتابوں کی دکان میں چلے جائیے۔ چھت تک کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی۔ یہ سب بکنے کے لئے پڑی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو قابل لوگوں نے لکھی ہیں اور فوراً فروخت ہو جائیں گی لیکن باقی سب اگلے سال جمعہ بازار میں نصف قیمت پر بکنے آئیں گی۔ اب اگر کسی معجزے کے طفیل میری کتاب Best Seller ثابت ہوئی تو اس کا پہلا ثواب تو ناشر کو ملے گا اور دوسرا محکمہ انکم ٹیکس کو۔ باقی ماندہ یا واماندہ حصہ ہمارے لئے بچے گا۔ لیکن کتاب کے Best Seller ہونے کے امکانات ناپید ہیں۔ آخر یہ ''دوامی جوانی کے نسخے'' ''دل جیتنے کے گر'' یا ''لکھ پتی بننے کے راز'' قسم کی کتاب تو ہے نہیں کہ کتاب کے بازار میں آنے سے پہلے ہی حاجت مند قطار میں کھڑے ہو جائیں گے۔ بس ایک خودنوشت ہے اور وہ بھی غریب گراؤ چوکی۔ اس کے

ذاتی حالات میں کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس کی بجائے تو کھانا پکانے کی کتاب لکھ دیتا تو شاید پیٹ پوجا کے شائقین ایک نئی کتاب کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے خرید ہی لیتے مگر سوانح عمری سے تو پیٹ نہیں بھرتا...... جی ہاں، بالکل درست۔ خودنوشت کی بجائے میں ''آملیٹ بنانے کے ایک سو طریقے'' خوشی سے لکھ دیتا لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آملیٹ بنانے کا مجھے پہلا طریقہ ہی نہیں آتا۔ کچن کے امور میں تو میں اس قدر بے بس ہوں کہ کبھی میرا باورچی ناراض ہو کر چل دے...... (اور وہ اکثر چل دیتا ہے) ...... تو میری فاقہ کشی سے بچنے کی ایک ہی وجہ ہے کہ میرے گھر میں مونگ پھلی کا وافر ذخیرہ ہے۔ ویسے یہ بھی نہیں کہ میں نے کھانا پکانے کی کتاب لکھنے کا خیال ترک کر دیا ہے۔ ضرور لکھوں گا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے نقل مار کر سینڈوچ بنانے، کافی تیار کرنے، قیمے پکانے کی تراکیب اکٹھی کر لی ہیں اور...... اب ذرا جگر تھام کر سنیئے...... جدت کے طور پر میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس کتاب کی فوری فروخت کے لئے ہر گاہک کو ہر جلد کے ساتھ ایک ابلا ہوا انڈا بھی دیا جائے یعنی کتاب کے سرورق پر رکھ کر پیش کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ بے شمار لوگ جو ادب سے زیادہ انڈوں کے رسیا ہیں، کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ آپ کہیں گے یہ خیال تو پاگل خانے کی پیداوار لگتا ہے۔ نہیں، عزیز قاری! ایسا مت سوچو۔ تاریخ میں کئی ایسی جدتوں کا ذکر ہے جو ابتدا میں دیوانگی نظر آئیں لیکن بعد میں نوع انسانی کے لئے نعمتیں ثابت ہوئیں۔ مثلاً آپ چوہےدان ہی کو لے لیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ چوہے ہمیشہ چوہےدانوں ہی سے نہیں پکڑے جاتے تھے۔ آج سے چند صدیاں پیشتر اگر کوئی شخص چوہا پکڑنا چاہتا تھا تو دانتوں میں روٹی کا ٹکڑا لے کر اپنا منہ چوہے کے بل کے بالکل قریب لے جاتا تھا تا آنکہ چوہا بل سے سر نکالتا تھا اور روٹی کے لالچ میں پھنس جاتا تھا۔ پھر کسی ذہین شخص نے چوہےدان ایجاد کیا تو لوگوں نے ...اتی طریقے سے چوہا پکڑنے کے مقابلے میں نئی ایجاد کے متعلق بڑے شکوک کا اظہار کیا مگر سو، دو سو سال میں یہ شکوک بتدریج رفع ہوتے رہے حتیٰ ...ن چوہےدان کی افادیت مسلّم ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر آدمی کے اندر ایک کتاب ہوتی ہے مجھے تو یہ بھی دوسری کہاوتوں کی طرح

مشکوک سی بات لگتی ہے۔ مثلاً کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ

رات کو سونا سویرے ، صبح کو اُٹھنا شتاب

صحت و دولت بڑھائے عقل کو دے آب و تاب

لیکن سوچیں تو یہ ایک بیکاری کہاوت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اکثر معقول لوگ رات کو ایک یا دو بجے سوتے ہیں اور اگلے روز تین بجے سہ پہر سے پہلے نہیں اٹھتے۔ اگر کوئی نوکر انہیں ایک دو منٹ پہلے جگانے کی کوشش کرے تو جاگتے بعد میں ہیں اور نوکر کو برخواست پہلے کرتے ہیں۔ مذہبی ضرورت کے تحت اٹھنا دوسری بات ہے ورنہ شوقیہ سحر خیزوں میں صرف خاکروب اور مرغ ہی رہ جاتے ہیں۔ بہرحال آپ نے مرلن منرو کو کبھی چھ بجے بیدار ہوتا نہ دیکھیں گے۔ بات ذرا لمبی ہوگئی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ یہ کتاب لکھنے کی وجہ وہ کہاوت نہ تھی کہ ہر آدمی کے اندر ایک کتاب ہوتی ہے، بلکہ یہ کہ اپنی ذات کے متعلق لکھنے میں بے پناہ کشش ہوتی ہے، چنانچہ میں کچھ تو اس کشش کا شکار ہوا اور کچھ اپنے ہوشیار ناشر کا۔ جس نے میرے ہاتھ میں تھوڑا سا ایڈوانس تھما کر سبز باغ کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔

مگر مصنف اور ناشر کے لئے کتاب کے لکھے جانے سے اس کا بکنا زیادہ اہم ہے اور بکری کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ خدا کی وہ اسفل مخلوق ہے۔ جسے انگریزی میں Browser اور اردو میں ''ورق گرداں'' یا مفت خواں کہتے ہیں۔ یہ شخص آپ کو کتابوں کی دکان میں نظر آئے گا۔ یہ آپ کی کتاب کی شہرت کی خبر سن کر ایک چور کی طرح دکان میں داخل ہوتا ہے۔ کتاب تک پہنچتا ہے اور دیرینہ مشق کے طفیل کتاب کو کہیں سے سونگھتا ہے' کہیں سے چاٹتا ہے اور پینتالیس منٹ میں کتاب کے پار ہو جاتا پھر دکاندار سے آنکھ بچا کر بغلی دروازے سے نکل جاتا ہے کہ اگلے روز کسی دوسری کتاب پر چھاپہ مارے۔ اگر مالک دکان اسے جاتا دیکھ کر اس سے پوچھ بیٹھے کہ حضرت! کون سی کتاب چاہئے تو کسی ایسی کتاب کا نام لے دیتا ہے جو چین تک نہ مل سکے۔ مثلاً ''دیوار چین کے معمار کا فلسفۂ حیات''

عجیب بات ہے کہ یہ شخص چالیس روپے دے کر بڑے گوشت کے ایک دو کلو تو خرید لے گا لیکن یہی رقم کتاب پر خرچ کرتے ہوئے سو بار سوچے گا۔اور آخر چوری یا مفت خوری کو ترجیح دے گا۔

یہ کتاب شروع کرتے وقت میرا خیال تھا کہ خودنوشت ہی تو ہے۔قلم اٹھاؤں گا اور لکھتا چلا جاؤں گا لیکن جلد ہی احساس ہوا کہ اپنے متعلق لکھنا اور سچ لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔شاید کچھ خدا کے بندوں نے اپنے سوانح بالکل سچ سچ لکھ دیئے ہوں۔لیکن اکثر مصنف سوانح حیات رقم کرتے ہوئے دکھاتے کم ہیں اور چھپاتے زیادہ ہیں۔نتیجہ یہ کہ ان کی کتابیں باتوں' گھاتوں اور آدھے یا پورے جھوٹوں کا ملغوبہ بن جاتی ہیں۔

بلکہ آج کل تو اکثر خودنوشتیں کسی دوسرے پیشہ ور قلمی مزدور سے لکھوائی جاتی ہیں اور ایسی کتابیں چلاّ چلاّ کر قاری سے کہہ دیتی ہیں۔میں خودنوشت نہیں، غیر نوشت ہوں۔یہ الگ بات ہے کہ جناب خواجہ یا جناب شیخ جن کی زندگی کی یہ نام نہاد داستان ہوتی ہے' بڑے فخر سے اسے اپنی تصنیف بتائیں گے۔بلکہ آپ سے پوچھیں گے:''پڑھی ہے میری خودنوشت آپ نے؟ میں نے کبھی لکھا نہ تھا۔اب معلوم ہوا کہ لکھنا شروع کردوں تو کتنا آسان ہوتا ہے......اب ایک اور کتاب لکھوں گا'' ویسے جناب خواجہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کتاب کا ایک لفظ بھی ان کے قلم سے نہیں ٹپکا۔وہ صرف جھوٹ بولنے کے گنہگار ہیں۔جھوٹ لکھنے کا ذمہ دار کوئی گمنام بھوت[1] لکھاری ہے۔

دراصل یہ زمانہ ہی بھوت لکھاریوں کا ہے۔بڑے بڑے سیاست دانوں' ایکٹروں' ایکٹریسوں' رئیسوں اور صنعت کاروں کی خودنوشتیں دراصل بھوت نوشتیں ہوتی ہیں۔یعنی کسی بے مایہ بھاڑے کے مصنف کی جگالی کا نتیجہ اور مجھے ان قلم فروشوں سے ازلی بیر ہے۔بے شک میں کوئی جے چل یا ہیمنگ وے بلکہ مس کیتھلین ونسر بھی نہیں بلکہ مس ونسر کا تو ہم جنس بھی نہیں ہوں تاہم' بخدا اس کتاب کا ہر لفظ میں نے خود سوچا اور لکھا ہے۔اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ' یہ مجھ پر اور میرے خدا پر چھوڑ دیں۔جیسا کہ اشارہ کر چکا ہوں۔نوے فیصد خودنوشتیں نوے فیصد افسانہ ہوتی ہیں اور صرف دس فیصد حقیقت۔اگر ان خودنوشتوں کے ہیرو اپنے متعلق سب کچھ سچ لکھ دیں تو ان کی

---

[1] اس شخص کو جو کسی دوسرے شخص کے لیے کتاب لکھے، انگریزی میں Ghost Writer کہتے ہیں

سکونت کے لئے امریکہ بھر میں کافی جیل نہ مل سکیں گے۔ دروغ گوئی امریکہ کی بڑی صنعتوں میں سے ایک ہے۔

یہ نہیں کہ صاف اور سچی خودنوشت لکھی ہی نہیں جاسکتی۔ لکھی جاسکتی ہے لیکن شائع بعداز مرگ ہی ہوسکتی ہے۔ مثلاً میں چاہوں تو اپنی زندگی کی ایسی سنسنی خیز سچائیاں بنک میں جمع کراسکتا ہوں کہ میری موت کے بعد چھاپی جائیں تو امریکہ کی کتابی دنیا میں زلزلہ آ جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میرے بعد میری کتاب Best Seller بھی ثابت ہوئی اور ریڈرس ڈائجسٹ نے اس کا خلاصہ بھی چھاپ دیا تو مجھے کیا ثواب پہنچے گا۔ ریڈرس ڈائجسٹ کے ہزار ہا ڈالر کے چیک کا مجھے کیا فائدہ؟ چنانچہ جب تک ایسے چیکوں کو ساتھ لے جانے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں ہوتا، سچی خودنوشت لکھنا بیکار ہے۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ آدمی ڈکشنری پڑھا کرے اور گھر کی باڑ کی چھائی کرتا رہے۔

# محبت ایک مغالطہ ہے

اپنی تعریف اچھی نہیں ہوتی لیکن سچی بات کہہ دینے میں کوئی حرج بھی نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ میں اچھا قابل بلکہ بہت ہی ذہین اور زیرک جوان ہوں بلکہ نہایت تیز اور تیکھا ہوں۔ اور خاص طور پر اپنے ہم جماعت شاہد کے مقابلے میں تو افلاطون ہوں۔ ہے تو وہ بھی میرے ساتھ یونیورسٹی کا طالب علم بلکہ میرا روم میٹ بھی ہے لیکن دماغ کے اعتبار سے نرا ڈھور ہے۔ آپ نے کبھی ڈھور کو سوچتے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا نا؟ بس شاہد بھی نہیں سوچتا۔ صرف دوسروں کی نقل کرتا ہے۔ امتحان میں بھی اور لباس میں بھی۔ فیشن کا تو وہ اس قدر سودائی ہے کہ کوئی نیا لباس دیکھ لے تو جب تک نقل نہ کر لے باؤرا سا لگتا ہے۔

اتفاق سے ہماری ڈامیسٹری کے دو گلگتی لڑکے چھٹیوں سے لوٹے تو پوستین پہن کر آئے اور اپنے دو دوستوں کے لئے بھی پوستین لے آئے۔ جب شاہد نے ان دونوں کو شام کے وقت پوستین پہنے ٹہلتے دیکھا تو رال ٹپکاتے ہوئے دل کی گہرائی سے منمنایا ''ہائے پوستین'' ...... اور پھر پوستین حاصل کرنے کے لئے کڑھنے لگا۔

دوسرے روز کیا دیکھتا ہوں کہ شاہد بستر میں لیٹا ہوا ہے اور چہرے پر کچھ اس قدر جان لیوا

---

"Love is a fallacy" By Max Schulman

کرب طاری ہے گویا پیٹ کا السر پھٹنے والا ہو۔ میں نے متفکر ہوتے ہوئے کہا:

''شاہد تمہاری حالت اچھی نہیں۔ اب بلنا مت میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں''۔

شاہد ایک نحیف آواز میں بولا ''ڈاکٹر نہیں' پوستین''۔

''کیا ہوا ہے پوستین کو؟'' میں نے دروازے سے مڑتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے پوستین چاہئے'' شاہد نے دہرایا۔

''مجھے پتہ چل گیا کہ شاہد کا عارضہ جسمانی نہیں' روحانی نہیں بلکہ پوستینی ہے۔ بہر حال پوچھا۔

''کیا کرو گے پوستین کو؟''

''پہنوں گا اور کیا کروں گا۔ ارشاد نے پہن رکھی ہے، ندیم نے پہن رکھی ہے۔ میں ہی احمق تھا۔ سارے پیسے کتابوں پر خرچ کر دیئے اور اب پوستین کے لئے جیب میں کوڑی بھی نہیں۔''

''لیکن شاہد میاں' پوستین تو ایک بہت پرانا فیشن ہے۔ کبھی ہمارے دادے' نانے پہنا کرتے تھے۔''

''تمہیں دادے' نانے نظر آرہے ہیں۔ مگر کیمپس کے لڑکے نظر نہیں آتے؟ دیکھتے نہیں ہمارے کتنے ہم جماعت پوستینیں پہنے پھر رہے ہیں۔؟ تم ہوتے کہاں ہو؟''

''میں لائبریری میں ہوتا ہوں۔'' میں نے لائبریری اس لئے کہا کہ بڑے لوگ اکثر لائبریری سے پرہیز کرتے ہیں۔''

شاہد اٹھ کھڑا ہوا اور کسی قدر چلا کر کہنے لگا۔

''تم لائبریری کے کیڑے ہو تو ہو' میں نہیں۔ مجھے بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے میں پوستین لے کر رہوں گا۔''

میں نے پیار سے سمجھایا۔ ''دیکھو شاہد ذرا عقل سے کام لو۔ پوستین مضر صحت چیز ہے۔ اس سے بو آتی ہے۔ یہ بھاری بھی ہے اور بھدی بھی۔ پھر جہاں بیٹھو' تھوڑی سی اون بطور یادگار جھڑ

جاتی ہے۔"

"بھئی رہنے بھی دو اپنی فلاسفی کو۔ پوستین فیشن ہے اور میں پوستین لے کر رہوں گا۔ خواہ مجھے کچھ قربانی ہی کرنا پڑے۔"

"پیاری سے پیاری چیز بھی قربان کر دو گے؟"

"بالکل کر دوں گا"

میں نے سر کھجایا اور سوچنا شروع کر دیا۔ مجھے یاد آیا میرے باپ کے کپڑوں میں ان کے کالج کے زمانے کی ایک پوستین پڑی ہے۔ مگر خدا جانے کس صندوق میں بند ہے اور وہ صندوق کہاں رکھا ہے لیکن ڈھونڈنے پر یقیناً مل جانے کا امکان تھا۔ ادھر شاہد کے پاس بھی ایک "چیز" تھی جس کی مجھے ضرورت تھی وہ چیز بالکل اس کے پاس تو نہ تھی لیکن اس پر اس کا پہلا حق ضرور تھا۔ میرا اشارہ جمیلہ کی طرف ہے جو شاہد کی دوست تھی۔

جمیلہ پر ایک عرصہ سے میری آنکھ تھی۔ کوئی جذباتی وابستگی تو نہ تھی مگر وہ جذبات میں ہلچل ضرور پیدا کر سکتی تھی۔ بہر حال میرا دل سراسر پاسبانِ عقل کے زیرِ نگرانی تھا۔ مجھے جمیلہ کی ضرورت بعض دنیاوی تقاضوں کی وجہ سے تھی۔ بات یہ تھی کہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور چند سال بعد پریکٹس کرنے والا تھا۔ اب ایک وکیل کی پیشہ وارانہ کامیابی میں ایک صحیح قسم کی بیوی بڑی اہم ہوتی ہے میرا مشاہدہ تھا کہ شہر کے تمام کامیاب وکیل خوبصورت اور ذہین بیویوں کے شوہر تھے۔ ادھر جمیلہ میں...... ایک کمی کے سوا...... خوبیاں ہی خوبیاں تھیں حسین؟ جی ہاں' بالکل۔ صرف تھوڑی سی مشاطگی کی ضرورت تھی۔ انداز و ادا؟ سرو کی طرح سیدھا قد اور کبک دری کی سی چال! ہر حرکت میں نفاست' میں نے اسے سوّیاں کھاتے دیکھا تھا۔ کیا مجال جو ایک سوئی بھی کاروان سے ٹوٹنے پائے!...... ذہین؟ جی نہیں۔ یہی جمیلہ کی خامی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میری صحبت میں اور میری تعلیم سے چند دنوں میں جمیلہ کا ذہن چمک اٹھے گا۔ آخر ایک خوبصورت مگر سادہ لوح لڑکی کو چمکانا اتنا مشکل نہیں جتنا ایک سمارٹ مگر بدشکل لڑکی کو خوبصورت

بناتا۔ سو میں نے شاہد سے کہا:

''شاہد! ایک بات بتاؤ! تمہیں جمیلہ سے محبت ہے؟''

''محبت؟'' شاہد چونکا۔ ''بھئی وہ لڑکی ہے تو بڑی پیاری مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھے اس سے محبت بھی ہے۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو......؟''

''بتاتا ہوں، مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تم دونوں کا شادی وغیرہ کا ارادہ تو نہیں؟''

''نہیں تو، بس ملنا جلنا ہے۔''

''کیا جمیلہ کی نگاہ میں کوئی اور مرد ہے؟''

''میرے علم میں تو نہیں۔ مگر آج جمیلہ کو اتنا باریک کیوں چھان رہے ہو؟''

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا:

دوسرے لفظوں میں اگر تم درمیان سے ہٹ جاؤ تو میدان صاف ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو مگر تمہیں صاف میدان کی ضرورت کیا پڑی؟''

''کوئی خاص ضرورت نہیں۔'' میں نے معصومانہ انداز سے کہا اور اپنے سوٹ کیس میں کچھ کپڑے رکھنے لگا۔ شاہد بولا:

''کہاں کی تیاری ہے؟''

''گھر جاؤں گا''

''تو پھر یار ایک کام کرنا۔ اپنے ابا سے میرے لئے کچھ رقم ادھار لے آنا میں پوستین خرید لوں گا۔''

''میں غالباً اس سے بھی بہتر کارنامہ انجام دوں گا۔'' میں نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

دوسرے روز گھر سے لوٹا میں نے سوٹ کیس کھولا تو شاہد سے کہا: ''ذرا آؤ اور دیکھو'' اور ساتھ ہی بھاری بھر کم اون کا ڈھیر اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا:

''یہ میرے باپ کی زمانہ طالب علمی کی پوستین ہے لیکن بالکل نئی لگتی ہے۔''
شاہد نے پوستین دیکھی تو چلا دیا۔
ارے! یہ تو سچ مچ پوستین ہے اور سچ مچ نئی لگتی ہے''......اور پھر اضطراراً اس نے اپنے ہاتھ اور چہرہ پوستین میں گاڑ دیئے اور دیر تک گاڑے رکھے۔
''پسند آئی پوستین؟''میں نے پوچھا۔
''بے حد''اس نے پوستین کو کلاوے میں لیتے ہوئے کہا۔''کیا لوگے اس کا؟''
''تمہاری سہیلی جمیلہ''میں نے آرام سے کہا
''جمیلہ؟'' شاہد نے دہشت زدہ سے لہجے میں پوچھا''تو تمہیں پوستین کے عوض جمیلہ چاہئے؟''
''تم نے بالکل درست سمجھا ہے۔''میں نے سکون سے کہا۔
شاہد نے پوستین اٹھا کر ادھر پھینکی اور بولا:''یہ نہیں ہو سکتا۔''
''تو نہ سہی'' میں نے لاپروائی سے کہا۔''اگر تمہیں فیشن کی رو کے ساتھ نہیں چلنا تو یہ تمہارا فیصلہ ہے۔''
میں کرسی پر بیٹھ گیا اور بظاہر اخبار پڑھنے لگا لیکن انکھیوں سے شاہد کا مطالعہ کرتا رہا۔ بے چارہ ایک ٹوٹا پھوٹا انسان تھا۔ پہلے تو اس نے پوستین کو اس طرح دیکھا جیسے ایک خالی جیب والا بچہ مٹھائی کی دکان کو دیکھتا ہے لیکن پھر اس کا عزم بیدار ہوا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ دو لمحے ہی گزرے تھے کہ پھر اس کی نگاہیں پوستین پر گڑ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک دفعہ پھر نگاہیں تو پھیر لیں لیکن اس کے عزم میں وہ قوت نہ تھی۔ دفعتاً اس کے سر کی حرکت تیز ہوگئی۔ کبھی ادھر پوستین کو دیکھتا کبھی ادھر خلا میں تکنے لگا۔ ظاہر تھا کہ خواہش بڑھ رہی ہے اور مدافعت دم توڑ رہی ہے آخر کار اس کی نظریں پوستین پر جم گئیں اور جم کر رہ گئیں۔
میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

ویسے مجھے جمیلہ سے کوئی محبت وغیرہ تو نہیں اور نہ کوئی شادی وادی کا وعدہ کیا ہے۔

''ٹھیک ہے'' میں نے مختصراً کہا

''اور سوچا جائے تو آخر میرے لئے جمیلہ کیا شے ہے یا میں اس کے لئے؟''

'' کچھ بھی نہیں'' میں نے تائید کی۔

''بس عارضی سا ساتھ تھا۔ چند باتیں' چند قہقہے اور بس''

''ذرا پوستین تو پہن کر دیکھو۔'' میں نے کہا۔

شاہد نے فی الفور تعمیل کی۔ پوستین نے اوپر سے اس کے کان اور نیچے سے ٹخنے ڈھانپ دیئے تھے اور وہ بالکل مردہ بھیڑوں کا ڈھیر نظر آتا تھا۔ مگر وہ خوش تھا۔ بولا:

دیکھو۔ مجھے کتنی فٹ آئی ہے''

میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا'' تو پھر ہو گیا سودا؟''

بولا'' بالکل ہو گیا'' اور پھر آگے بڑھ کر مجھ سے زوردار پنجہ ملایا۔

اگلی شام میری جمیلہ سے پہلی ملاقات تھی گویا ابتدائی جائزے کی ملاقات جائزہ یہ لینا تھا کہ جمیلہ کو اپنے میعار تک لانے کے لئے کتنی محنت درکار ہے۔ میں اسے ایک ریستوران میں ڈنر کے لئے لے گیا۔ کھانا کھا چکی تو بولی'' ہائے کتنا' لذ تی'' کھانا تھا'' میں اس کی'' زباندانی'' سے ذرا سہم گیا۔

پھر ہم سینما گئے۔ باہر نکلے تو کہنے لگی:

''ہائے کتنی'' شانی'' فلم تھی۔'' پھر اسے گھر چھوڑنے گیا اور الوداع کہا تو بولی' آج کتنی ''لطفی'' شام تھی!''

میں گھر لوٹا تو خاصا مایوس تھا۔ میری مہم اتنی آسان نہ تھی جتنی میں سمجھا تھا۔ لڑکی کی بے خبری بے پناہ تھی لیکن اسے محض علم سکھانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ یہ بھی کہ صحیح طور پر سوچا کیسے جاتا ہے۔ یہ بڑا طویل اور ثقیل منصوبہ تھا ایک دفعہ تو جی چاہا کہ جمیلہ بی بی کی چھٹی کر دیں لیکن پھر اس

کی خداداد جسمانی دلربائی کی طرف خیال گیا' اس کا کمرے میں داخل ہونے کا حسین انداز یاد آیا۔ اس کا چھری کانٹوں کا فن کارانہ استعمال نگاہوں کے سامنے آیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ایک کوشش اور ضرور کروں گا۔

جیسا کہ میرا طریقہ ہے' میں نے ایک پروگرام بنایا اور اسے منطق Logic کی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا میں خود بھی ان دنوں کالج میں منطق پڑھ رہا تھا۔

جب اگلی شام ہم ملے تو میں نے کہا'' جمیلہ آج ہم شملہ پہاڑی پر جائیں گے اور باتیں کریں گے۔''

بلّا بلّا۔'' جمیلہ کے منہ سے بے اختیار یہ خوشی کا بے معنی کلمہ نکلا۔'' ضرور جائیں گے۔''

جمیلہ کے متعلق جو جی چاہے کہہ لو' تھی وہ خوش باش لڑکی۔ چنانچہ ہم پہاڑی پر گئے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ جمیلہ نے میرا منہ تکتے ہوئے کہا'' کیا باتیں کریں گے آج؟''

''منطق کے متعلق' 'میں نے کہا۔

''منطق؟'' وہ ہنسی'' چلیں کریں۔''

''منطق'''' جمیلہ بی بی' سوچنے کی سائنس ہے۔''

میں نے شروع کیا'' لیکن صحیح طور پر سوچنے سے پہلے ہمیں عام مغالطوں کا علم ہونا چاہئے۔ مغالطے درست سوچ کے دشمن ہیں۔''

''او بھلّے بھلّے۔'' جمیلہ نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

میں ذرا چونک سا گیا لیکن سبق جاری رکھا'

پہلے ہم مغالطہ نمبر 1 پر غور کریں گے۔ یہ مشہور مغالطہ ہے اور اسے کہتے ہیں۔'' مغالطہ عمومیہ۔''

''مومیا؟'' جمیلہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

''مومیا نہیں' عمومیہ...... مغالطہ عمومیہ ایک ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو بظاہر بالکل درست

لگتی ہے مگر کئی لحاظ سے غلط بھی ہوتی ہے۔ میں مثال سے واضح کرتا ہوں:

''ورزش مفید ہے اس لئے ہر ایک کو ورزش کرنا چاہئے۔''

''ٹھیک تو ہے۔'' جمیلہ جھٹ بولی۔ ''میرا مطلب ہے ورزش سے ہی تو فگر بنتی ہے۔''

''جمیلہ'' میں نے پیار سے کہا۔ ''لیکن اس دلیل میں نقص ہے۔ یہ اصول ہر حالت میں درست نہیں۔ مثلاً دل کے مریض کے لئے ورزش مفید نہیں' مضر ہے۔ اس لئے تم یہ تو کہہ سکتے ہو کہ ورزش عام طور پر مفید ہے لیکن ہر ایک کے لئے نہیں۔ سمجھ آئی؟''

''سمجھ تو نہیں آئی لیکن لطف آ رہا ہے۔ آپ بولتے جائیں۔''

میں نے بولنا جاری رکھا۔ آگے ہے مغالطہ نمبر 2۔ اسے شتابی چھلانگ کہتے ہیں''

''واہ وا' تو مغالطہ چھلانگ لگائے گا۔؟''

جمیلہ نے سادگی سے پوچھا۔ میں نے جمیلہ کی لایعنی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

''بھئی مثال سے واضح ہو جائے گا اور مثال یہ ہے' تمہیں چینی زبان نہیں آتی مجھے بھی نہیں آتی۔ شاہد کو بھی نہیں آتی۔ تو کیا ثابت ہو گیا کہ ساری یونیورسٹی میں کسی کو بھی چینی زبان نہیں آتی۔؟''

''میرا تو یہی خیال ہے'' جمیلہ جھٹ بولی۔ میرا پارہ چڑھنے لگا۔ لیکن ضبط کرتے ہوئے کہا:

''یہ تو مغالطہ ہے جمیلہ صرف تین مثالوں سے نتیجہ نکال لینا' گویا چھلانگ لگا کر نتیجے پر پہنچ جانا' غلط بات ہے سمجھے''؟

''کچھ' کچھ'' جمیلہ بولی'' کوئی اور مغالطے بھی آپ کو آتے ہیں۔ ذرا مزے دار سے''؟

مزے دار کے لفظ پر غصہ تو آیا مگر پی گیا۔ بہر حال میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا:

''جمیلہ' دیر ہو رہی ہے' اٹھو اب چلیں۔ آج رات تم یہ دو مغالطے اچھی طرح ہضم کر لینا۔ باقی انشاءاللہ کل شام۔''

میں نے جمیلہ کو لڑکیوں کے ہوسٹل میں چھوڑا۔ ہر چند کہ اس نے شب بخیر کہتے ہوئے اقرار

کیا کہ آج کی رات بڑی پُر لطف تھی، تاہم میں اپنے کمرے میں منہ لٹکائے داخل ہوا۔ آگے شاہد خراٹے لیتا سو رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے جی تو چاہا کہ اسے جگا کر کہوں 'سنبھالو اپنی جمیلہ کو میں باز آیا ایسی منطق پروف لڑکی سے۔ لیکن پھر سوچا۔ ایک شام تو میں اس کند ذہن لڑکی پر ضائع کر ہی چکا ہوں۔ ایک شام اور سہی شاید اس کی راکھ میں کوئی چنگاری زندہ ہو جسے ہوا دے کر شعلہ بنا سکوں۔

اگلی شام جمیلہ ملی تو میں نے چھٹتے ہی کہا

''جمیلہ ذرا غور سے سننا۔ مغالطہ نمبر 3 اس کا نام ہے ''جواب چنا'' مغالطہ''

''ہائے یہ تو بڑا مزے دار ہوگا۔ چنے کی چاٹ بھی بنتی ہے۔''

خدا جانے میں نے جمیلہ کی بے ربطی اور بے وقوفی کو کیسے برداشت کیا۔ بہر حال کہا:

''تو غور سے سنو۔ ایک آدمی کسی اسامی کے لئے درخواست دیتا ہے۔ افسر اس سے پوچھتا ہے: تمہاری تعلیمی قابلیت کیا ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔ جناب میری ایک بیوی ہے۔ چار بچے ہیں۔ بیوی اپاہج ہے بچے بھوکے بھی ہیں اور ننگے بھی۔ سردیاں آنے والی ہیں اور گھر میں کوئلہ بھی نہیں......''

یہ سن کر جمیلہ کے گالوں پر دو آنسو ڈھلک آئے۔ بولی ''اف خدایا' بے چارا کتنا دکھی ہے''

میں نے جمیلہ کو سمجھایا' دکھی تو بے چارہ ضرور ہے مگر یہ کوئی دلیل تو نہیں۔ اس نے اپنی تعلیم کی تفصیل بتانے کی بجائے قصۂ غم سنانا شروع کر دیا اور اس طرح جواب ''چنا'' کے مغالطے کا ارتکاب کیا۔

جمیلہ بدستور ہچکی لیتے ہوئے بولی' تمہارے پاس رومال تو ہے؟ ذرا دینا''

میں نے اسے رومال دیا اور کوشش کی کہ وہ اس فرضی امیدوار کی ہمدردی میں جان ہلکان نہ کر دے۔ جب اپنے آنسو پونچھ چکی تو بولی:

''معافی چاہتی ہوں۔ میں دل کی بہت ملائم ہوں۔''

میں نے دل میں کہا۔ دل کی جتنی جی چاہے ملائم ہو۔ خدایا دماغ کی اتنی ملائم نہ کرنا۔

بہر حال اس موضوع کو وہیں چھوڑتے ہوئے کہا'

''اب نمبر 4 مغالطہ آتا ہے۔ جھوٹی مشابہت' ڈاکٹر ایکس رے دیکھ کر علاج کرتا ہے۔ وکیل مسل دیکھ کر مقدمہ لڑتا ہے اور مستری نقشہ دیکھ کر مکان بناتا ہے تو پھر طلبا کو امتحان دینے کے لئے کتابیں کیوں نہ دے دی جائیں۔''

جمیلہ میری بات سن کر اچھل پڑی۔ بولی'' سو فیصد درست کیا غضب کی بات کی ہے''۔

''جمیلہ'' میں نے اسے مزید اچھلنے سے باز رکھتے ہوئے کہا''جمیلہ یہ دلیل بالکل غلط ہے۔ ڈاکٹر' وکیل اور مستری اپنا اپنا کام کرتے وقت امتحان نہیں دے رہے ہوتے کہ انہیں کیا آتا ہے اور کیا نہیں آتا مگر طلبا کے امتحان کا تو مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ ان کے علم یا بے علمی کا اندازہ ہو جائے۔''

جمیلہ بولی'' میں تو پھر بھی کہوں گی کہ امتحان میں کتابیں ساتھ لے جانے کا خیال اچھا ہے۔''

میں نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا۔

''اب اس بات کو ختم سمجھو' اور اگلی سنو''

''سناؤ مگر کوئی خوبصورت سا مغالطہ بیان کرنا''

''تم سنو تو' مغالطہ نمبر 5 کہلاتا ہے جھوٹی ڈینگ''۔

''بولی؟'' بڑا سخت نام ہے لیکن چلیں بتائیں یہ مغالطہ کیا کرتا ہے؟''

''کہا جاتا ہے کہ اگر میڈم کیوری کو ایک کیمرے کی فلم اور تارکول کا ٹکڑا ایک دراز میں بند کرنے کا اتفاق نہ ہوتا تو ریڈیم دریافت نہ ہوتا''

جمیلہ بولی'' بالکل سچ اور ہاں فلم سے یاد آیا تم نے ندیم کی نئی فلم دیکھی ہے۔ ہائے کتنا خوبصورت لگتا ہے......''

''جمیلہ'' میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا'' اگر تم ایک لمحہ کے لئے ندیم سے خلاصی پا سکو تو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ اگر میڈیم کیوری فلم اور تارکول اکٹھی نہ رکھ دیتی تو ریڈیم دریافت ہی نہ ہوتا۔ بالکل ممکن ہے کوئی اور شخص اسی طرح یا کسی اور طریقے سے

ریڈیم کا پتہ لگالیتا۔ ایسا بے جان مفروضہ مان لینا تو نری حماقت ہے۔''

لیکن جمیلہ ابھی تک ندیم کے خیال سے خلاصی نہیں پا سکی تھی۔ بولی:

''انہیں چاہئے کہ ندیم کو بہت سی فلموں میں ہیرو کا پارٹ دیں اسے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں''

میں نے دل میں سوچا' کہ کیا غبی لڑکی سے پالا پڑا ہے لیکن چلو اسے ایک آخری موقع دے دیتے ہیں۔ چنانچہ کہا:

''جمیلہ اگلا مغالطہ نمبر 6 ہے۔ کنویں میں زہر'' ''کنویں میں زہر؟'' جمیلہ حیران ہو کر بولی' ''کس بدبخت نے ڈالی ہے؟''

حسب معمول میں نے جمیلہ کی بے ربط بات کو نظر انداز کیا اور کہا

''فرض کرو دو آدمیوں کے درمیان بحث ہو رہی ہے ان میں سے ایک اٹھ کر کہتا ہے لوگو' یہ شخص جو مجھ سے بحث کر رہا ہے۔ اوّل درجے کا جھوٹا ہے اس کی کسی بات پر یقین نہ کرنا''

''اب سوچو' جمیلہ اور بتاؤ اس شخص کی بات میں کوئی نقص ہے؟''

جمیلہ نے ایک لمحہ کے لئے اپنی خوبصورت بھنویں سکیڑیں جیسے سچ مچ سوچ رہی ہو پھر اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی پھر بڑے مدبّرانہ انداز میں بولی:

''یہ تو بڑی نامناسب بات ہے وہ شخص ابھی بولا ہی نہیں اور اسے جھوٹا کہہ دیا یہ شرافت نہیں''

''بالکل درست'' میں نے پرزور تائید کی۔ ''سو فیصد درست''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ اس شخص نے اپنے مخالف کی بات سننے سے پہلے ہی اسے جھوٹا کہہ دیا یعنی کنویں میں زہر ملا دیا۔ یہ واقعی شرافت سے بعید ہے۔ جمیلہ مجھے تم پر فخر ہے''

جمیلہ خوشی سے اڑنے لگی اور موقع کی مناسبت سے میں نے کہہ دیا ''میری پیاری جمیلہ۔ مغالطے کوئی مشکل چیزیں نہیں۔ بس ذرا سوچنے کی ضرورت ہے۔ اچھا آؤ ہم جتنے اسباق کر چکے

ہیں انہیں ذرا دہرا ڈالیں''

''ضرور ضرور'' جمیلہ نے فتح مندی کے عالم میں بازو لہراتے ہوئے کہا۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ جمیلہ آخر اتنی کند ذہن نہ تھی' میں نے سارے سبق ایک ایک کر کے دہرا ڈالے۔

میں نے مغالطوں کے نام اور نمبر رٹوا دیئے۔ پھر ان کی مثالیں ذہن نشین کرائیں۔

دراصل جمیلہ کو پڑھانا ایسا ہی تھا جیسے سرنگ کھودنا۔ شروع میں تو فقط کھودنا ہی تھا کہ آگے سب اندھیرا تھا مگر آخری کوشش رنگ لائی اور سرنگ کے سرے پر روشنی کا ایک ننھا سا روزن دکھائی دیا۔

پھر یہ روزن بتدریج بڑھنے لگا اور آخر کار اچانک روشنی کا سیلاب سا آ گیا۔ بے شک مشقت میں نے بے اندازہ کی تھی مگر انعام کے پیشِ نظر بھول گئی۔ کیا یہ کارنامہ نہ تھا کہ میں نے جمیلہ کو منطق سکھا دی تھی اور اب وہ ہر لحاظ سے میری رفاقت کے قابل تھی۔ یقیناً اب وہ میرے لئے ایک قابلِ فخر بیوی' میرے بچوں کے لئے قابلِ رشک ماں اور میرے دوستوں کیلئے قابلِ رشک میزبان بن سکتی تھی۔

یہ نہ سمجھیں کہ مجھے جمیلہ سے محبت نہیں تھی' بالکل تھی مگر کچھ اس قسم کی محبت جو فن کار کو اپنے فن پارے سے ہوتی ہے چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلی ملاقات پر جمیلہ کو اپنے جذبات سے آگاہ کروں گا اب وقت آ گیا تھا کہ ہمارا تعلیمی تعلق رومانی تعلق میں ڈھل جائے۔

دوسرے روز جب ہم اپنے پرانے درخت کے نیچے ملے تو میں نے چھوٹتے ہی کہا:

''جمیلہ' آج ہم مغالطوں کی باتیں نہیں کریں گے۔''

''کیوں؟'' جمیلہ نے ذرا مایوسانہ لہجے میں پوچھا۔

''اس لئے کہ'' میں نے خاص طور پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس لئے کہ ہم پانچ روز سے باہم مل رہے ہیں اور یہ ملاقاتیں بڑی خوش گوار ثابت ہوئی ہیں، لہٰذا ظاہر ہے کہ ہم ایک

دوسرے کے لئے بالکل موزوں ہیں''

جمیلہ جھٹ بولی'' شتابی پھلانگ آپ مغالطہ نمبر 2 میں مبتلا ہیں۔''

'' کیا کہا جمیلہ تم نے؟'' میں نے حیرانی میں پوچھا۔

بولی'' میں نے عرض کیا تھا کہ آپ شتابی پھلانگ' والے مغالطے کے مرتکب ہیں یہ صرف پانچ ملاقاتوں کی بناپر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے موزوں ہیں؟''

میں حیران تھا اور ہنسی بھی آئی کہ میری شاگرد نے اپنا سبق کس ہوشیاری سے یاد کر رکھا تھا' چنانچہ میں اس کے ہاتھ کو کسی قدر پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا:

'' پیاری جمیلہ' پانچ ملاقاتیں کم نہیں ہوتیں آخر کیک کا ذائقہ معلوم کرنے کے لئے ضروری تو نہیں کہ سارے کا سارا کیک کھایا جائے۔''

جمیلہ فوراً چلائی!'' بھونڈی مثال' آپ مغالطہ نمبر 4 میں لڑھک گئے ہیں۔

میں کیک نہیں ہوں لڑکی ہوں۔''

میں اس پر بھی مسکرایا تو سہی لیکن کسی قدر گھبرایا بھی۔ جمیلہ نے اپنے اسباق ضرورت سے ذرا زیادہ یاد کر لئے تھے۔ اب میں نے ایک نئی چال چلنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور چال یہ تھی کہ اپنی محبت کا پورے زور سے اظہار کر دیا جائے، چنانچہ کہا:

''جمیلہ' پیاری جمیلہ' مجھے تم سے محبت ہے تم میری کائنات ہو۔ تم ہی میرے مہر و ماہ ہو۔ میری محبوبہ' اب کہہ دو کہ تم ہمیشہ کے لیے میری ہو۔ اگر تم نے انکار کر دیا تو میری دنیا تاریک ہو جائے گی۔ میں دیوانہ ہوں، مجھ پر کھانا پینا حرام ہو جائے گا۔ میں بھوکا پیاسا جان دے دوں گا۔''

اتنا کہہ کر میں سمجھا کہ اب ضرور جمیلہ پر رقت طاری ہوگی، چنانچہ اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

جمیلہ نے بلا تاخیر جواب دیا'' مغالطہ نمبر 3' بے ربط اپیل''

میں دانت پیس کر رہ گیا میرے اندر ایک مایوسی کی لہر اٹھی جسے میں نے بمشکل دبایا

بہر حال میں جمیلہ پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ ایک مصنوعی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا:

''جمیلہ' بھئی تم نے تو مغالطوں پر خوب عبور حاصل کر لیا ہے۔ ماشاءاللہ''

''داد کا شکریہ'' جمیلہ مختصر بولی۔

''مگر معلوم ہے'' میں نے فوراً کہا:''یہ مغالطے تمہیں سکھلائے کس نے ہیں''

''تم نے''

''تو پھر میرا حق تم پر کچھ نہیں بنتا؟ یہ سوچو کہ اگر میں نہ ہوتا تو تمہیں معلوم ہی نہ ہوتا کہ مغالطے ہوتے کیا بلا ہیں۔''

جمیلہ نے آرام سے کہا:

''جھوٹی ڈینگ مغالطہ نمبر 5 اگر تم نہ سکھاتے تو کوئی اور سکھا دیتا''

میری پیشانی پر فوری پسینہ چھوٹا۔ پسینہ پونچھتے ہوئے میرے منہ سے نکلا:

''جمیلہ تم ہر چیز کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لیتی ہو؟ یہ تو بس کلاس روم کی باتیں ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ سکول کی باتوں کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا''

''مغالطہ عمومیہ نمبر 1'' جمیلہ نے میری طرف فہمائشی انگلی لہراتے ہوئے کہا:

''سکول کی کچھ باتوں کا زندگی سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ استاد جی!''

میرا صبر جواب دے گیا۔ میں نے لگی لپٹی بغیر کہا:

''جمیلہ صاف صاف کہہ دو۔ میرا ساتھ دوگی یا نہیں؟''

''بالکل نہیں''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ آج ہی میں نے شاہد سے ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے''

میں نے یہ سنا تو جمیلہ سے زیادہ شاہد پر غصہ آیا جس نے میرے ساتھ جمیلہ سے

دستبرداری کا وعدہ کیا تھا۔ غضب میں میرے منہ سے نکلا:

''جمیلہ، کیا سچ مچ تم اس چغد کا ساتھ دو گی؟ اس جھوٹے کا؟ اس ٹھگ کا؟''

جمیلہ نے نہایت سکون سے کہا:

''کنویں میں زہر' مغالطہ نمبر 6 مخالف کو بولنے سے پہلے جھوٹا کہہ دینا شرافت نہیں''۔

میں زور سے احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے بمشکل تمام اپنی لے کو ذرا مدھم رکھا اور کہا:

''بہت اچھا' اگر تم منطق کی اتنی ہی دلدادہ ہو تو ذرا میری بات سنو اور اسے اپنی منطق سے جانچو اور تولو...... یہ تو مانتے ہو نا کہ میں ایک قابل طالب علم اور ذہین انسان ہوں اور یہ کہ میرے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے لیکن ذرا شاہد کو دیکھو پرلے درجے کا خرد ماغ اور نکھٹو ہے جسے یہ بھی خبر نہیں کہ اگلے وقت کی روٹی کہاں سے ملے گی۔ ان حالات میں شاہد کا ساتھ دینے کی کوئی ایک منطقی دلیل بھی دے سکتی ہو؟''

جمیلہ نے اٹھتے ہوئے کہا:

''جی ہاں' دے سکتی ہوں...... شاہد کے پاس پوستین ہے''

# ضرورت ہے ایک خوشامدی کی

میں کافی کی پیالی کے لئے انٹرکان میں داخل ہو رہی تھی کہ سامنے سے کالج کے زمانے کا میرا ایک خوب رُو ہم جماعت اشرف آتا دکھائی دیا۔ اشرف کو دیکھے مجھے کم و بیش پندرہ برس گزر چکے تھے۔ میں نے اسے پہچان لیا لیکن وہ میرے قریب سے گزرا تو بالکل بیگانوں کی طرح۔ مجھ سے نہ رہا گیا' میں نے کسی قدر ملامت کے لہجے میں کہا:

''اشرف' مجھے پہچانا نہیں؟ میں کشور ہوں''

اشرف نے ایک لمحے کے لئے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ پھر یک لخت اس کے ہونٹوں پر وہی دیرینہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولا تو اپنی غلطی کی اس خوبصورتی سے تلافی کی کہ دل جیت کر لے گیا۔ کہنے لگا۔

''ارے کشو! تم؟ اللہ کتنی خوبصورت لگ رہی ہو! کتنی کم عمر!! بھلا میں تجھے کیسے پہچان سکتا تھا؟''

اشرف نے دو چار اور باتیں کیں اور رخصت ہو گیا' لیکن مجھے ترستا چھوڑ گیا۔ جو کچھ اس نے میری صورت اور عمر کے متعلق کہا تھا' بالکل سچ نہ سہی' ذرا جھوٹ ہی سہی' لیکن ہائے کتنا پیارا جھوٹ

---

"I Love a Nice Liar" By Hilde Garde Dolson

تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس دلربا جھوٹے کا دنیا کے اُس سرے تک پیچھا کرتی رہوں۔ کافی کی میز پر بیٹھی تو مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں پینتیس سال کی نہیں، فقط پندرہ سال کی کانونٹ سکول کی طالبہ ہوں...... خوشامد جھوٹی سہی' مگر کتنی دلکش ہوتی ہے! کوئی عورت تعریف کے بغیر کیسے جی سکتی ہے؟

زندہ ہیں کتنے لوگ محبت کئے بغیر؟

شاید مجھے جھوٹی تعریف کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ میں نے چھوٹی عمر میں سچائی کے ہاتھوں بڑے دردناک چرکے سہے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے سکول کی لڑکیوں نے ڈرامہ کھیلا۔ سسٹر نے ساری کلاس کو سامنے کھڑا کر کے مختلف کردار چنے۔ نصرت بادشاہ بنی، غزالہ ملکہ، نجمہ شہزادی، عابدہ پری لیکن پتہ ہے مجھے کیا پارٹ ملا؟...... نوکرانی کا! مجھے چنتے ہوئے سسٹر نے خاص طور پر اطمینان کا سانس لیا۔ کہنے لگی:

''کشور' تمہارا ناک نقشہ اس پارٹ کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔''

کرنی کہیں کی! وہ کہتے ہیں نا کہ فلاں شخص اس بے رحمی سے سچ بولتا ہے کہ آبلے پڑ جاتے ہیں' تو ہماری سسٹر بھی اسی قماش کی کچھ لگتی تھی۔ میں نے یہ پارٹ تو کر دیا' لیکن سال بھر اپنے آبلے سہلاتی رہی۔

سو جس لڑکی کا ماضی سچائی کے ہاتھوں اتنا مجروح ہو چکا ہو' اس کا حال جھوٹی تعریف کے بغیر کس قدر بدحال ہوگا۔ جی ہاں' جی چاہتا ہے کہ میری ہر کمزوری...... مثلاً ناک...... کو ہر وقت کوئی تعریف کے ریشمی پردے سے ڈھانکتا رہے۔

سچی بات ہے' مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ فرشتے باقی سب کچھ ٹھیک ٹھاک بنا کر ناک کیوں چپٹی کر دیتے ہیں۔ جیسے اس پر غلطی سے یا شاید جان بوجھ کر پاؤں رکھ دیا ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ ایسے فرشتوں سے بازپرس نہیں کرتا؟ مگر انہیں کچھ سزا مل بھی گئی' تو مجھے کیا فائدہ؟ میری ناک میں تو نوک اور نزاکت آنے سے رہی...... کہتے ہیں کہ خدائی کاموں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ ٹھیک ہے، نہیں دیں گے مگر ایک بات ہماری ضرور ماننا پڑے گی۔ ایسے اناڑی فرشتوں کے سپرد عورتوں کی ناکیں کسی

صورت نہ کی جائیں۔ یہ انہیں فرشتوں کا کیا دھرا ہے کہ پلاسٹک سرجن دونوں ہاتھوں سے عورتوں کو لوٹ رہے ہیں...... میں اپنی ناک کے آپریشن کے لئے ابھی آدھی فیس ہی جمع کر سکی ہوں۔

اور وہ جو میرے مقابلے میں ملکہ بنی تھی نا عابدہ' ذرا اس کی فکر تو دیکھو۔ کمر اور پیٹ میں تمیز ہی نہیں ہو سکتی۔ ملکائیں ایسی ہوتی ہیں؟ مگر وہ ہمتی بہت ہے۔ بزم آرائی کی شوقین ہے۔ کچھ اور نہیں کر سکتی' تو اپنی قمیض تین انچ اور تنگ کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر دیکھنے والی یا والے کی توجہ وہ گوشت کھینچنے لگتا ہے جو قمیض میں پھڑ پھڑا رہا ہوتا ہے۔ توجہ کا مقام بدلنے کے لئے وہ چوڑیوں سے بھی بڑی سنہری بالیاں کانوں میں لٹکا لیتی ہے۔ ہم نے تو کبھی ایسا نہیں کیا!

میں جب کبھی کسی محفل میں جاتی ہوں' اپنے خیال میں بڑی دلچسپ گفتگو کا آغاز کرتی ہوں تا کہ حاضرینِ مجلس میری آواز سنتے ہی تالیوں کے شور میں کہہ اٹھیں "بخدا کشور کیا جادو ہے تمہاری زبان میں" لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ جونہی زبان کھولتی ہوں، پارٹی اور اس کے قرب و جوار میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ سوچتی ہوں کہ جس طرح غالب نے اپنے ساتھ ایک نوحہ گر رکھنے کا منصوبہ بنایا تھا، میں بھی ایک ستائش گر رکھ لوں جو اشارہ پاتے ہی جھوم جھوم کر کہنے لگے "کشور بی بی۔ صدقے تمہاری میٹھی باتوں کے" اور ایک دوسرا اشارہ ملنے پر مزید نعرہ لگائے "نئیں ریساں بی بی کشور دیاں" مگر حیف کہ غالب کی طرح مجھے بھی ایک ستائش گر رکھنے کا مقدور نہیں اور بلا معاوضہ ستائش کرنے والے پہلے ناک نقشہ خصوصاً ناک دیکھتے ہیں۔

میں جب کسی عزیز کو تحفہ دیتی ہوں' یعنی تحفے کو بنا سنوار کر' رنگین کاغذ میں لپیٹ کر' گوٹے کی ڈوری سے باندھ کر' ہنستی مسکراتی پیش کرتی ہوں' تو قدرتاً اس قسم کے جواب کی توقع رکھتی ہوں۔

"کشور' پیاری کشور' کیا لاجواب تحفہ چنا ہے تم نے! کیا کہنا تمہارے حسنِ انتخاب کا۔ آؤ تمہارے ہاتھ چوم لوں"۔

لیکن ہوتا کیا ہے کہ محبوب محترم پیکٹ کھول کر پہلے تو ہونٹ لٹکا کر تحفے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں اور پھر اسے میز پر رکھ کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہتے ہیں:

''ارے یہ شے ہے کیا؟ یہ کسی کام بھی آتی ہے؟''

اور جب میں فخر یہ کہتی ہوں کہ جانِ من' یہ ایک ایسا قلم ہے جو سگریٹ لائٹر کا کام بھی دیتا ہے' تو فرماتے ہیں:

''اچھا' یہ وہی چیز ہے جو للو کئی روز سے لئے پھرتا ہے!''

للو ہمارے ہمسائے کے کند ذہن لڑکے کا نام ہے۔ ٹھیک ہے' للو نے بھی یہ چیز کہیں سے حاصل کر لی ہے' لیکن مجھے یاد دلانے کا یہ کون سا محل ہے؟ تحفہ جیسا بھی ہو' تحفہ ہونے کی وجہ سے تعریف کا مستحق ہوتا ہے، لیکن ان سب لوگوں کو سچائی کی پڑی ہے۔ دراصل ان لوگوں کی بنیادی تعلیم میں خرابی ہے۔ ان کی کچی پہلی کے قاعدے میں الف بے کے بعد پہلا سبق اسی طرح شروع ہوتا ہے ''سچ بولو' پورا تولو'...... خدا جانے سچ بولنے سے کس کا بھلا ہوتا ہے؟ عورتوں کا تو نہیں ہوتا۔ پورا تولنا بھی اتنا ہی فضول ہے آپ کسی دکان دار سے پوچھ لیں!

میرے لئے اپنے کپڑوں کا انتخاب بھی مصیبت بن گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی معمولی چیز بھی پہن لوں' تو دیکھنے والے کہہ اٹھیں ''کشور' اس لباس میں تو تم تصویر لگتی ہو' تصویر!'' کس چیز کی تصویر' مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو اتنی خوبصورت تحسین میں خفیہ کیڑے ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے تو بس ایک ٹکڑا سا' گاؤ تکیے کے برابر سفید جھوٹ چاہئے' جس کا مزے سے سہارا لے سکوں...... تو پچھلے اپریل' آمد بہار کی خوشی میں' میں نے ایک غرارہ سوٹ کا آرڈر دے دیا جس پر کاریگر نے اس قدر سلمے ستارے ٹانک دیئے کہ کہکشاں آدھی سے زیادہ خالی نظر آنے لگی۔ درزی نے سوٹ پہنا کر دیکھا' تو عش عش کر اٹھا۔ بولا

''بیگم صاحبہ! غرارہ ایک ایسا پہناوا ہے جو ہزاروں میں سے کسی ایک کو سجتا ہے اور وہ ایک آپ ہیں'' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ کلمہ درزی کے منہ سے نہیں، کسی آسمانی فرشتے کی زبان سے نازل ہوا ہے۔ میں اس کلمے کو گھولے بغیر پی گئی' مگر گھر پہنچتے ہی یہی سوٹ پہن کر اپنے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی اور آئینے سے پوچھا کہ

''آئینے سچ بتا کہ ہے سب سے حسین کون؟''

تو آئینے نے قانونِ شہادت کی اس دفعہ کا حوالہ دیا جس کی روح سے گواہ کو جواب دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اُف میرے اللہ! آئینے کے جواب نے تو مجھے مار کر رکھ دیا۔

میرا منگیتر میرے آئینے سے ذرا زیادہ باتمیز ہے۔ پہلی نگاہ پر تو وہ بھی مجھے غرارے میں دیکھ کر ذرا ٹھٹھک سا گیا' لیکن جلد ہی سنبھل کر مسکرانے لگا۔ میں نے بے تابی سے پوچھا:

''پسند آیا میرا غرارہ؟''

بولا'' ہاں ہاں' کیوں نہیں میں نے تمہیں آج تک اتنا حسین نہیں دیکھا...... '' اور یہ کہہ کر پسینے سے شرابور ہو گیا' لیکن پسینہ آنا کوئی بری بات نہیں۔ اسی لئے تو خدا نے رومال بنایا ہے۔ بہرحال میرے منگیتر نے...... خدا اسے خوش رکھے...... اگر جھوٹ بھی بولا' تو دلیر شرفاء کی طرح بولا جسے میں نے خود بھی ایک دلیر شریف زادی کی طرح قبول کیا...... دو چاہنے والوں کے درمیان کوئی کام کی بات تو ہوئی نا...... سچائی سے ہمیشہ فتنہ پھیلتا ہے' مگر میں سچ بولنے کے خلاف پروپیگنڈہ نہیں کر رہی۔ بلھے شاہ نے مدت ہوئی کہا تھا۔

''سچ آکھاں تے بھانبڑ بلدا اے''

کیا بلھے شاہ بھی پروپیگنڈی تھا؟

میں ایک عزیز دوست پرویز کو نہیں بھول سکتی۔ ہائے اتنی پیاری باتیں کرتا ہے' اتنی پیاری کہ جی چاہتا ہے...... خیر ایک دفعہ میں نزلہ زکام لے کر ہسپتال جا پہنچی۔ دوسرے روز پرویز عیادت کے لئے آیا۔ اس روز میری حالت جیسی بھی تھی قابلِ دید نہ تھی چنانچہ میں ناک منہ چھپائے کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اب پرویز کے مقدم میں میں نے چہرے سے آہستہ آہستہ کمبل سرکایا اور پہلے سرخ سلگتی آنکھیں اور پھر لال بھبھوکا ناک' پیش خدمت کی' تو ایک لمحے کے لئے پرویز بھی سُن ہو کر رہ گیا...... لیکن صرف ایک لمحے کے لئے...... اگلے لمحے میں اس نے کمال

ملائمت اور محبت سے کہا:

''کشور آج تمہارا چہرہ کیسا بھرا بھرا لگتا ہے۔ بخدا آج تمہاری رنگت میں ہیروں کی سی چمک ہے''

میں نے یہ سنا تو کمبل اتار کر اُدھر پھینکا اور یوں محسوس ہوا جیسے زکام سے آدھی شفا مل گئی ہے...... ہر ہسپتال کو چاہئے کہ خالص طبّی ضرورت کے طور پر ایک خوش گفتار جھوٹا اپنے سٹاف میں رکھے۔ خوبصورت ہو تو اور اچھا ہے۔

میرا فیملی ڈاکٹر بڑا اکھڑ ہے۔ میں جب بھی کسی درد کی شکایت لے کر جاتی ہوں تو اس توقع پر کہ مجھے کسی عجیب وغریب، افسانوی، رومانوی مرض کا مریض بتائے گا، مثلاً دردِ دل، زخمِ جگر وغیرہ لیکن ٹوٹی لگاتے ہی کہہ اٹھتا ہے ''بی بی، تجھے جوڑوں کا درد ہے'' اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا، جلتی پر تیل چھڑکتے ہوئے کہتا ہے ''اور اس عمر میں اور بیماری لگ بھی کیا سکتی ہے؟ اب یہ آخری دم تک تمہارا ساتھ دے گی'' ہے نا یہ ڈاکٹر خشکی اور بد مذاق؟ کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ''بی بی' یہ درد عارضی ہے۔ چاندنی راتوں میں یہ درد اکثر اٹھا کرتا ہے۔ ہفتے کی بات ہے، تھم جائے گا''...... اگر وہ یہ کہہ دیتا تو میں اس کی ٹوٹی چوم کر اپناؤں، بلکہ خونِ دل اس کی نذر کر دیتی اور ہفتہ بھر اپنا درد سینے سے لگائے رنگا رنگ خیالوں میں کھوئے رہتی۔ بعض کم فہم لوگ کہا کرتے ہیں کہ حسن کی طرح خوشامد بھی Skin Deep ہے یعنی اس کی گہرائی پتلی سی چمڑی سے زیادہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ چمڑی کے پار ہو جانا بھی کافی گہرائی ہے۔ اس سے زیادہ گہرا جانے کا شوق تو کسی آدم خور ہی کو ہو سکتا ہے...... بہر حال اوروں کا تو علم نہیں، لیکن میرے اپنے وجود میں خوشامد اتنی گہری جاتی ہے کہ دل کی تہہ کو جا چھوتی ہے۔ یہ تو نامراد سچائی اور صاف گوئی ہے جسے سن کر مجھے جوڑوں کا درد ہونے لگتا ہے۔ آئندہ آپ کو جوڑوں کا درد ہو تو فیملی ڈاکٹر کے پاس مت جائیں۔ کسی پرویز کو بلا کر دیکھیں۔ موئے ڈاکٹر سے کہیں زیادہ شفا بخش ثابت ہوگا۔

# کہتا ہوں سچ کہ......

پچھلی صدر میں ایک طرح کا فیشن تھا کہ بحری سفر سے لوٹنے کے بعد
جہاز راں حضرات مبالغہ آمیز اور دور از کار کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اسی
مبالغہ آرائی پر سٹیفن لیکاک نے ذیل کی کہانی میں اس قدر شدید طنز کیا
ہے کہ اس سے بڑا جھوٹ بولنے کیلئے کسی ملاح کیلئے گنجائش نہیں چھوڑی۔

اگست 1867ء کی بات ہے۔ میں ایک صبح سفینہ مسرت نامی جہاز میں داخل ہوا۔ یہ جہاز لندن کی بندرگاہ پر لنگر انداز تھا اور مجھے اس میں نائب کپتان (دوم) کی اسامی کے لئے چنا گیا تھا۔ گویا اس جہاز میں میری ملازمت کا یہ پہلا دن تھا۔

آیئے! ذرا میں اپنا تعارف کرادوں۔ میرا نام بہرام ہے۔ آج کل تو میں ذرا ادھیڑ سا لگتا ہوں لیکن اُن دنوں میں جوان بلکہ جوانِ رعنا تھا۔ خُوب رو، بلند قامت، شیر دل۔ سورج کی حدت اور چاند کی چاندنی سے میرا جسم سنہری رنگت اختیار کر گیا تھا۔ حالانکہ عام لوگ سورج اور چاند کے اثر سے سلیٹی رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ ستاروں نے میرے جسم پر ایک بالکل الگ اثر کیا تھا۔ میری پشت اور سینے پر جا بجا ستارہ نما نقوش تھے جو کبھی چاندی کے لگتے اور کبھی سونے کے۔

---

"Soaked in Seaweed" By Stephen Leacock

رہا میرا چہرہ تو وہ اگر ایک نگاہ پر ذہانت اور دیانت کی تصویر نظر آتا تھا تو دوسری نگاہ پر شرافت اور شرم وحیا کا پتلا معلوم ہوتا تھا۔ الغرض اپنی تعریف اچھی بات تو نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ میں ہمہ صفت موصوف تھا۔

جونہی میں نے تختہ جہاز پر قدم رکھا، سامنے ایک پانی سے بھرے ٹب میں اپنا عکس نظر آیا۔ عکس دیکھا تو سچی بات ہے ایک لمحے کے لئے اپنے متوازن جسم اور مضبوط اعضا پر فخر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''خوش آمدید، بہرام۔ جہاز پر آنا مبارک''

یہ تھے وہ الفاظ جو مجھے دیکھ کر جہاز کے کپتان بلال کے منہ سے نکلے۔ ہمارے درمیان پانی کا ٹب تھا۔ لیکن اس فاصلے کو ہم نے لمبے بازوؤں کے ساتھ پاٹ کر ہاتھ ملائے اور پھر ٹب کا چکر کاٹتے ہوئے بغلگیر ہو گئے...... کیا شاندار انسان تھا کیپٹن بلال! اس کی عمر؟ یہی کوئی تیس اور ساٹھ سال کے درمیان ہو گی۔ وہ بالکل کلین شیو لگتا تھا سوائے اس کے کہ اس کے چہرے پر دو چوڑی قلموں کے علاوہ ایک بھاری ڈاڑھی اور گاڑھی مونچھوں کا جوڑا بھی تھا۔ وہ ایک مضبوط تنے کا قدآور شخص تھا جس کی فراخ پشت پر بحریہ کی مفصل تاریخ لکھی جا سکتی تھی۔

پاس ہی نائب کپتان اول اور نائب کپتان سوئم کھڑے تھے۔ (میں نائب کپتان دوم تھا) مگر یہ دونوں میری موجودگی میں اپنے قد و رخ کے اعتبار سے بالکل یتیم نظر آتے تھے اور ان کی آنکھوں سے یوں لگتا تھا جیسے کسی خطرے سے دوچار ہوں۔ دبکے ہوئے، سہمے ہوئے، بے توفیقے سے!

جہاز کا وقتِ رخصت قریب تھا یعنی اسی شام کو لنگر اٹھایا جاتا تھا۔ تختۂ جہاز پر خوب چہل پہل تھی۔ ملاح بڑی پھرتی سے مستولوں میں میخیں ٹھونک رہے تھے۔ دریچوں کو رنگ رہے تھے اور ہر کل پُرزہ چمکا رہے تھے۔ کیپٹن بلال میگافون منہ سے لگائے حکم دے رہا تھا:

''دیکھو جوانو! کام کرو مگر تھک مت جانا۔ ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں۔ دھوپ سے بچ کر رہنا، ارے گامے، رسوں پر سے احتیاط سے گزرنا۔ ابے نورے، آگے دیکھو، کول تار ہے۔ کہیں

پھسل کر سمندر میں نہ جا گرتا۔ اگلے جہاں میں کالے منہ کے کوئی نمبر نہیں ملتے۔

اور میں، عزیز قاری باد بان کے بانس پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا۔ جی ہاں، اپنی ماں کے متعلق۔ جب بھی حالات ذرا تاریک نظر آئیں، میں ماں کو یاد کرتا ہوں اور اگر حالات تاریک تر ہونے لگیں تو ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا ہوں اور باپ کو یاد کرتا ہوں...... اس کے بعد میں ہر آفت کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ لیکن قارئین! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیا میں نے ایک اور عزیز ہستی کو بھی یاد کیا؟ وہی ہستی جو میرے ماں باپ سے عمر میں کم اور حسن میں کہیں زیادہ تھی؟ جی ہاں ضرور یاد کیا۔ صبح سویرے جب میں جہاز کی طرف روانہ ہوا تھا تو وہ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ میرا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی تھی...... ''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا تھا اور پھر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا تھا:

''صرف پانچ سال ہی کی تو بات ہے۔ کوئی بحری سفر پانچ سال سے زیادہ نہیں لیتا اس کے بعد زیادہ سے زیادہ دو ایسے سفر ہو سکتے ہیں لیکن میں چوتھے سفر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا اور سیدھا اپنی محبوبہ کے انتظار کرتے بازوؤں میں آجاؤں گا اور اتنا مال کما لاؤں گا کہ جس سے مچھلیاں پکڑنے کا ایک سیکنڈ ہینڈ جال آسانی سے خریدا جا سکے۔ پھر ہم ساحل سمندر پر گھر بسا کر ہنسی خوشی مچھلیاں پکڑنے لگیں گے۔''

ادھر جہاز کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ملاح اپنا اپنا کام ختم کر کے کپتان کے اگلے حکم کے انتظار میں قطار میں کھڑے تھے۔ دفعتاً کپتان کی گرجتی ہوئی آواز آئی۔

''کیا سب تیاریاں مکمل ہو گئیں؟''

''آئی آئی، سر'' جواب میں تمام ملاح یک زبان ہو کر بولے۔

''تو پھر اٹھاؤ لنگر'' کپتان نے فیصلہ کن انداز میں حکم دیا۔

اگلی صبح ایک سہانی صبح تھی۔ نہایت ملائم اور موافق ہوا چل رہی تھی اور ہم بندرگاہ سے نکل کر، ساحل انگلستان سے ہٹ کر رود بار انگلستان میں رواں تھے۔ اگر رود بار انگلستان آپ نے

نہیں دیکھی تو پھر آپ نے دنیا کا دلکش ترین سمندری منظر نہیں دیکھا۔ یہ جہازوں کی عالمی گزرگاہ ہے اس میں ہر ملک کا جہاز موجود ہے۔ یہ خوبصورت جہاز ہالینڈ کا ہے۔ وہ سکاٹ لینڈ کا اور وہ ونزویلا کا۔ حتیٰ کہ ایک آدھ امریکی جہاز بھی نظر آجاتا ہے۔ چین کے رنگا رنگ بجرے تو رنگین مچھلیوں کی طرح ادھر ادھر لپک رہے ہیں اور حدِ نگاہ تک جنگی جہاز موٹر کشتیاں برفانی تودے اور لکڑیوں کے گٹھے بکھرے پڑے ہیں۔ الغرض ایک حسین منظر ہے جس کے متعلق صرف ایک بات عرض کرنا باقی ہے کہ گہری دھند کی وجہ سے ایک گز سے آگے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سو، قارئین محترم آپ اس حسین منظر کی دلکشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سمندر میں ہم تین دن گزار چکے تو سمندری بیماری سے مجھے اتنا افاقہ ہو گیا کہ میں نے باپ کو یاد کرنا چھوڑ دیا۔ تیسرے روز اچانک کیپٹن بلال میرے کیبن میں آیا اور کہنے لگا۔

''بہرام! آج سے تمہیں دوہری ڈیوٹی دینا ہوگی''

''کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا ''اس لئے نائب کپتان اول اور نائب کپتان سوم، ہر دو سمندر میں گر پڑے ہیں'' اور یہ کہتے ہوئے بلال نے مجھ سے آنکھیں چرانے کی کوشش کی جیسے مجھ سے کچھ چھپا رہا ہو۔

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا ''بہت اچھا سر'' لیکن مجھے شدید تجسس کا احساس ہوا۔ کہ ایک نہیں، جہاز کے دو سینئر افسر ایک ہی رات کو سمندر میں کیسے گر سکتے ہیں؟ یعنی سمندر میں! یہ چارپائی سے فرش پر گرنے کی واردات نہ تھی۔

یقیناً دال میں کچھ کالا تھا!

پھر دو ہی دن گزرے تھے کہ کیپٹن بلال ناشتہ کی میز پر آئے تو خلافِ معمول کچھ گم سم کچھ بے کل سے نظر آئے۔ میں نے پوچھا ''خیر تو ہے سر؟''

''نہیں بہرام، خیر ہی تو نہیں۔ آج صبح سویرے ہم نادر کو بھی کھو بیٹھے ہیں''

میں نے حیرت سے پوچھا! ''تو کیا وہ بھی سمندر میں گر پڑا؟''

''دراصل غلطی میری تھی، بہرام'' بلال قصہ بیان کرنے لگا۔''علی الصبح دور فاصلے پر سمندر میں مجھے ایک برفانی تودہ نظر آیا۔ میں نے نادر کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر کہا کہ ذرا تودے کی حرکات تو نوٹ کرلو۔ لیکن اچانک نادر میرے کندھوں سے جدا ہو کر سمندر میں جا گرا۔''

''کیا آپ نے اسے سمندر سے نکالنے کی کوشش کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں ہو سکا'' کیپٹن بلال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

دو روز خیریت کے گزرے مگر پھر یہ پُر اسرار وارداتیں شروع ہو گئیں۔ جمعرات کی صبح خبر آئی کہ عرشۂ جہاز کے دائیں پہلو کے دو پہرے دار لاپتہ ہیں۔ جمعہ کو بڑھئی کا مددگار لونڈا غائب ہو گیا۔ ہفتے کی شب ایک معمولی سے واقعہ سے مجھے کچھ اندازہ ہونے لگا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

آدھی رات کا وقت ہو گا۔ میں خاموشی سے جہاز کی چرخی پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مجھ سے ایک فاصلے پر تاریکی میں کیپٹن بلال، ایک کیبن کے خدمت گار کو پشت سے لٹکائے چپکے چپکے عرشے پر جا رہے ہیں۔ یہ خدمت گار لڑکا کریم بڑا ذہین تھا اور مجھے بہت اچھا لگتا تھا، چنانچہ میں بھی چھپتا چھپتا ان کے پیچھے چل پڑا۔ بھلا دیکھوں تو سہی، کپتان صاحب لڑکے کے ساتھ سلوک کیا کرتے ہیں اور سلوک انہوں نے یہ کیا کہ جونہی عرشے کے کنارے پر پہنچے، پہلے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر میدان خالی پا کر لڑکے کو دھم سے سمندر میں پھینک دیا۔ اور خود آرام سے اپنے کمرے کی راہ لی گویا سمندر میں تو صرف سگریٹ کا ٹکڑا پھینکا تھا۔

سو، یہ تھا اس معمے کا حل، جناب کیپٹن بہ نفس نفیس اپنے عملے کے افراد کو ایک ایک کر کے سمندر کی موجوں اور مچھلیوں کی نذر کر رہے تھے۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر ملے تو کیپٹن صاحب حسب معمول مصنوعی پریشانی کے لہجے میں بولے:

''آج رات بے چارہ کریم بھی سمندر میں گر پڑا۔ ہماری بدقسمتی''

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کسی قدر جوش میں آ کر کہا:

''کیپٹن، جھوٹ مت بولو۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے اس لڑکے کو سمندر میں پھینکا ہے''

کیپٹن بلال یک لخت خاموش ہو گیا اور ایک حیرانی کے عالم میں مجھے دیکھنے لگا۔ کئی لمحوں کے بعد آخر ایک مجرمانہ لہجے میں بولا:

''تم ٹھیک کہتے ہو، بہرام میں نے ہی اسے ڈبویا ہے اور ان سب کو بھی جو پہلے غرق ہو چکے ہیں بلکہ سچ پوچھو تو جو باقی رہ گئے ہیں، ان کو بھی، سوائے تمہارے، سمندر کی نذر کرنے کا ارادہ ہے۔ مگر دیکھو بہرام تم ابھی جوان ہو، طاقت ور ہو، شاید مجھ سے بھی طاقت ور۔ تمہارے سامنے زندگی کے رنگا رنگ عزائم ہیں۔ تم قابل اعتماد ہو، لہٰذا میں تم سے اپنا منصوبہ نہیں چھپاؤں گا مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟''

میں خاموش رہا مگر نیم رضامندی میں سر ہلا دیا۔

اس پر کیپٹن بلال مسکرایا۔ میرا کندھا تھپتھپایا اور اٹھ کر اپنے میز کی دراز سے ایک پیلے رنگ کا نقشہ نکال لایا۔ جسے پھیلا کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ نقشے کے مرکز میں ایک دائرہ تھا۔ اور دائرے کے مرکز میں ایک نقطہ جس پر حرف خ رقم تھا۔ نقشے کے ایک کنارے پر حرف ش درج تھا۔ اور مقابل کے کنارے پر ج۔

میں نے پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

''تو کیا تم سمجھ نہیں گئے، یہ کیا ہے؟'' بلال نے حیرت سے پوچھا اور پھر بولا!

''یہ ایک جزیرے کا نقشہ ہے''

''تو یہ بات ہے؟'' میں نے کسی قدر جوش سے کہا۔ ''اور ش سے مراد غالباً شمال ہوگی اور ج سے جنوب''۔

بہرام نے حیران ہو کر میرا نام لیا اور میرا منہ چوم لیا۔ بولا ''کس قدر ذہین ہو تم۔ تم نے تو آدھے سے زیادہ معمہ حل کر لیا''

''مگر حرف خ سے کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خ سے مراد ہے خزانہ۔ دفن شدہ خزانہ'' بلال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نقشے کو الٹا اور اس کی پشت پر سے مندرجہ ذیل عبارت پڑھ کر سنائی۔

''حرف خ وہ مقام ہے جہاں ریت میں خزانہ مدفون ہے اس میں پانچ لاکھ سنہری پونڈ ہیں جو ایک بھورے رنگ کے سوٹ کیس میں بند ہیں''۔

''مگر جزیرہ ہے کہاں؟'' میں نے کسی قدر بے تابی سے پوچھا۔

''یہ مجھے معلوم نہیں'' بہرام بولا ''مگر میں اس سمندر کا کونہ کونہ چھان ماروں گا تا آنکہ جزیرہ میرے قدموں میں ہوگا۔''

میں نے کہا ''مگر کپتان صاحب، جب تک جزیرہ نہیں ملتا، اس وقت تک کیا کریں گے؟''

بلال نے مجھے آنکھ ماری اور بولا،

''پہلا کام تو یہ کریں گے کہ ملاحوں کی تعداد کو گھٹائیں گے تاکہ خزانہ کم از کم ہاتھوں میں تقسیم ہو''

پھر اس نے میرے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا اور مجھ سے پوچھا۔

''دو گے نا میرا ساتھ میرے عزیز دوست؟ ہم دونوں باقی سب کو سمندر میں پھینک دیں گے۔ سوائے شاہد باورچی کے، پھر خزانہ کھودیں گے اور عمر بھر عیش کریں گے۔''

مجھے اس شخص کی خامیوں کے باوجود اس پر پیار آ گیا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عزیز قاری، ہاں کہہ کر کیا میں نے کوئی گناہ کیا؟ دیکھیں نا میں ابھی ناپختہ نوجوان تھا۔ ساتھ ہی مجھے کچھ کرنے کا شوق تھا۔ کچھ بننے کا۔ میرے ذہن میں ایک تابناک مستقبل کا تصور تھا۔

مدفون خزانہ میری آرزوؤں کا جواب تھا۔ میں کیسے ہاں نہ کرتا؟ چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ کیپٹن بلال کے ہاتھ میں دیا اور کہا:

''میں تمہارے ساتھ ہوں''

''بہت خوب'' بلال بولا ''اب آؤ، ذرا دیکھیں ہمارے ساتھی کن حالات میں ہیں''

میں بڑھا اور ملاحوں کے کمرے میں گیا۔ کمرے کی حالت خاصی خستہ تھی۔ دیواروں کے ساتھ بھدے بھدے پلنگ بچھے تھے جن کے درمیان پردے لٹکا دیئے گئے تھے۔ اس روز اتوار تھا۔ تقریباً سب کے سب قمیص شلوار میں تھے جونہی میں کمرے میں داخل ہوا' وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے' مجھے سلام کیا اور پھر ان میں سینئر ملاح جس کا نام خادم تھا' مجھ سے مخاطب ہوا۔

''سر آپ کو بتانا میرا فرض ہے کہ ملاحوں میں شدید بے چینی ہے'' اس پر باقی ملاحوں نے مکمل تائید میں سر ہلایا۔ خادم نے اپنی معروضات جاری رکھیں۔

''سر! ہم لوگ اس بات پر سخت ناخوش بلکہ خائف ہیں کہ ہمارے ساتھی یکے بعد دیگرے سمندر میں گر کر ہلاک ہو رہے ہیں''...... پھر یکایک خادم نے کسی قدر گستاخانہ انداز اور بلند آواز میں کہا'' یہ بڑا ظلم ہے' سر! اب ہم مزید زیادتیاں برداشت نہیں کریں گے۔''

''خادم'' میں اسے جھڑکتے ہوئے بولا ''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بحیثیت افسر میں تمہیں ایسے باغیانہ حالات کے اظہار کی اجازت نہیں دے سکتا۔ خاموش رہو۔''

میں نے واپس آ کر کیپٹن بلال کو بتایا کہ ملاح بغاوت پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

''یہ تو بڑی اچھی خبر ہے'' کیپٹن بلال اپنے دونوں ہاتھ جوش سے ملتے ہوئے بولا۔

''باغیوں کو مارنا تو یوں بھی جائز ہے۔ سو خدا نے چاہا تو ہم نصف سے زیادہ ملاح بغاوت فرو کرتے ہوئے ٹھکانے لگا دیں گے۔ علاوہ ازیں میرا خیال ہے' بحری قذاق بھی ہمیں ایک دو دن میں شرف ملاقات بخشنے والے ہیں۔ کچھ باغی ان کی تواضع میں صرف ہو جائیں گے۔ بہر حال یہ تو مستقبل کی باتیں ہیں۔ اب ذرا''...... یہاں بلال نے اپنی گفتگو روک کر کیبن بوائے کو بلانے کے لئے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ لڑکا فوراً حاضر ہوا۔ بلال بولا۔ ''کٹو میاں، ذرا جاؤ مسٹر خادم کو میرا اسلام کہو''

چند لمحوں میں خادم آ گیا۔ کیپٹن بلال نے اسے دیکھتے ہی افسرانہ مگر مہربانہ لہجے میں کہا۔

''ہیلو خادم' کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں' سر''

''اچھا دیکھو' پیشتر اس کے کہ ہم دوسری باتیں کریں۔ ذرا اس کھڑکی سے باہر جھانک کر یہ تو دیکھو کوئی طوفان وغیرہ کے آثار تو نہیں۔''

کیبن کی کھڑکی گول اور تنگ سی تھی۔ خادم نے ایک قریب پڑے ہوئے صندوق پر کھڑے ہو کر اپنا سر اور کندھے کھڑکی سے باہر نکالے اور ہر طرف دیکھ کر موسم کا جائزہ لینے لگا۔ ادھر کیپٹن بلال اور میں نے خادم کی ایک ایک ٹانگ پکڑی اور اسے کھڑکی میں دھکا دے کر سمندر کے حوالے کر دیا۔ کیپٹن نے فوراً جہاز کی ڈائری نکالی اور مجھے کہنے لگا۔

''بہرام' معاف کرنا۔ ہماری گفتگو میں ذرا غیر متوقع وقفہ آ گیا ہے۔ میں ذرا خادم کی موت کا ڈائری میں اندراج کر لوں۔''

اندراج کر چکا تو بولا'' جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، ان لوگوں نے سچ مچ بغاوت کی تو ہمارا کام اور آسان ہو جائے گا۔ بہر حال جب تک یہ لوگ بغاوت نہیں کرتے، اگر تم ایک یا دو ملاح فی ہفتہ ٹھکانے لگاتے چلو، تو میں شکر گزار رہوں گا۔''

تین روز کے بعد ہم نے راس امید کا چکر کاٹا اور بحر ہند کے پرسکون پانی میں داخل ہوئے موسم بھی موافق تھا۔ ہم نے تیز رفتاری سے سفر طے کرنا شروع کیا۔ چوتھے روز ایک قذاقوں کا جہاز نظر آیا۔ پیارے قاری' کیا آپ نے کبھی قذاق جہاز دیکھا ہے؟ اسے دیکھ کر بڑے بڑے سورماؤں کے دل دہل جاتے ہیں۔ ایک تو جہاز سر تا پا سیاہ رنگ کا تھا پھر اس کے بادبان سیاہ تھے۔ حتیٰ کہ اس کا جھنڈا بھی گہرا کالا تھا۔ باقی رہے اس کے ملاح تو وہ تمام سیاہ پوش تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے موت اپنا لشکر لے کر ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ دھیرے دھیرے قذاقوں نے اپنا جہاز ہمارے جہاز کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا اور دونوں جہازوں کو مضبوط رسی سے باندھ دیا۔ پھر دونوں جہازوں کے کناروں پر ایک چوڑا تختہ رکھ کر آمد و رفت کا

رستہ بنالیا اور ایک لمحے میں قذاقوں کا ایک پورا ریلا ہمارے ملاحوں پر پل پڑا۔

پورے دو گھنٹے لڑائی جاری رہی پھر باہمی رضامندی سے پندرہ منٹ کے لئے چائے کے وقفے کا اعلان ہوا ورنہ یہ قیامت کا معرکہ تھا۔ مخالف ملاح دست وگریباں تھے۔ کوئی پیچھے سے لات رسید کرتا۔ کوئی سامنے سے چانٹوں سے گال لال کر دیتا۔ کئی ایک نے ہاتھوں کی بجائے دانتوں سے کام لیا۔ اور مخالف کے جسم کا جونسا حصہ میسر آیا' اسی میں دانت گاڑ دیئے۔ ایک دیو قامت قذاق تو لئے کو گانٹھ دے کر سر کے گرد گھمانے لگا۔ اس ظالم نے اپنی گانٹھ کی ضربوں سے ہمارے ملاحوں کو پہلے ادھیڑا' اور پھر بکھیر کر رکھ دیا۔ اس پر کیپٹن بلال کو طیش آ گیا۔ اس نے چپکے سے ایک کیلا چھیلا' کیلا خود کھایا اور کھال قذاق کے پاؤں میں ڈال دی۔ اگلے لمحے میں وہ نابجار پوری تندی اور توانائی سے پھسلا اور خطِ مستقیم میں جہاز کے دوسرے کنارے تک پھسلتا چلا گیا۔ اور بالآخر ایک خوبصورت انداز میں سمندر میں لڑھک گیا۔ قذاقوں نے بلال کے ہاتھوں میں کیلے کا پورا گچھا دیکھا تو گھبرا اٹھے اور بالآخر دونوں جہازوں کے کپتانوں نے باہمی رضامندی سے ہار جیت کے بغیر مقابلہ ختم کر دیا۔ پھر ایک خیر سگالی کے ماحول میں رسی کھول کر جہازوں کو الگ کیا گیا اور فریقین اپنے اپنے سفر پر چل نکلے۔

اب بلال مسکراتے مسکراتے میرے پاس آیا اور بولا "بہرام" تم ذرا عرشے کا خیال رکھنا میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں' بھلا ہمارے ملاحوں سے کتنے اس حد تک نڈھال ہو چکے ہیں کہ آسانی سے سمندر میں پھینکے جا سکیں۔"

چنانچہ وہ نیچے جہاز کے اندر چلا گیا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ تیزی سے واپس آ رہا ہے اور ہانپ رہا ہے میں نے پوچھا کیا ہوا کپتان صاحب؟"

بولا "غضب ہو گیا بہرام۔ جہاز ڈوب رہا ہے۔ کسی بدتمیز قذاق نے جہاز کے پیندے میں سوراخ کر ڈالا ہے۔ بالکل باریک سا سوراخ ہے مگر سائنس کی رو سے واضح ہے کہ زود یا بدیر جہاز پانی سے بھر جائے گا اور پھر ڈوب جائے گا۔"

میں نے کہا'' آپ نے زود بھی کہا ہے اور بدیر بھی۔ آپ کے خیال میں کتنا جلد یا دیر سے ڈوبے گا؟

بلال نے ایک ریاضی کی کتاب نکالی اور ایک مثال کو سامنے رکھ کر اپنے جہاز کی لمبائی چوڑائی، گہرائی اور سوراخ سے بے شمار ضربیں اور تقسیمیں دے کر مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچا۔

1۔ اس جہاز کی قسمت میں ڈوبنا لکھا ہے۔ اس عمل میں چند مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ اور چند سال بھی۔

2۔ اگر ہمیں سلامتی عزیز ہے تو اس جہاز کو چھوڑے بغیر چارہ نہیں۔

3۔ چونکہ ہمیں سلامتی عزیز ہے لہٰذا ہم آج ہی' اسی رات' جہاز کو خیر باد کہہ دیں گے۔

چنانچہ اسی رات' نیم شب کو' جب ملاح ریاضی کے تقاضوں سے بے خبر' نیچے سوراخ بند کرنے کی خوش فہمی میں مصروف تھے۔ ہم دونوں نے چپکے چپکے مستول کاٹ کر ٹکڑے بنائے پھر انہیں بوٹوں کے تسموں سے باہم باندھ کر بیڑا بنایا پھر جلد جلد اس پر خوراک کی دو پیٹیاں اور مشروبات کے چند کریٹ لادے۔ اس کے بعد جونہی جہاز ڈولتے ڈولتے ایک طرف جھکا، ہم نے بیڑا سمندر میں ڈال دیا اور آہستہ آہستہ چھپ چھپا کر اس بدانجام جہاز سے دُور سلامتی کے خطے میں نکل گئے اور ملاحوں کو غرقاب ہونے کے لئے پیچھے چھوڑ آئے ہماری منزل مقصود وہی خزانے والا جزیرہ تھا۔

کھلے سمندر میں ہمارا بیڑا یوں نظر آتا تھا جیسے سفید صفحے پر ایک سیاہ نقطہ ہو۔ لیکن خیر ہماری چھوٹی سی دنیا خاصی خود کفیل تھی۔ صبح ہوئی تو ہم نے شیو کی۔ نئے کپڑے پہنے اور اپنی خوراک اور مشروبات کی پیٹیاں نکالیں کہ ذرا اطمینان سے دعوتِ کام و دہن کریں لیکن عین اسی لمحے ایک خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا۔ ہم گوشت کے ڈبے اور مشروبات کی بوتلیں تو سینکڑوں کی تعداد میں لے آئے تھے لیکن انہیں کھولنے کے اوزار جہاز ہی میں بھول آئے تھے اور ان اوزاروں کے بغیر ڈبے اور بوتلیں کھولنا تو اتنا ہی مشکل تھا جتنا انگلیوں کے بغیر بانسری بجانا۔ سوچا اب کیا

کریں؟ ڈبے کیسے کھولیں؟ بوتلوں کی آہنی ٹوپی کیسے اتاریں؟ ہم نے پہلے تو ڈبوں اور بوتلوں پر اپنے ناخن آزمائے۔ پھر دانت گاڑے۔ کچھ حاصل نہ ہوا تو ان کے ٹوٹ جانے یا ٹیڑھا ہو جانے کا خطرہ مول لے کر انہیں بیڑے کی لکڑیوں پر دے مارا۔ اس عمل سے یا تو ان پر کوئی اثر ہی نہ ہوا اور یا اتنا زیادہ ہوا کہ ان کے تمام مشمولات سمندر میں بہہ گئے اور ہماری زبانیں تو ایک طرف، ہماری آنکھیں بھی ان بہتی نعمتوں کو سیر ہو کر نہ دیکھ سکیں۔ پھر ڈبوں اور بوتلوں کی شکست و ریخت سے جو افسوس ہوا وہ الگ! اس نقصان کے باوجود ہمارے سامنے ہر طرف بند ٹین اور بوتلیں پڑی تھیں لیکن اس ٹین بند خوراک کا ایک لقمہ اور بوتل بند مشروب کا ایک جرعہ بھی ہماری قسمت میں نہ تھا۔ ہماری بے بسی اور بدبختی مکمل تھی۔ صدفی صد۔

پھر ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے اور ہم بھوک کے مارے' اپنی اپنی خاموشی میں ڈوبے' مایوسی میں غرق' اپنی اپنی جگہ ڈھیر ہو کر لیٹ گئے اور کئی روز لیٹے رہے۔ پانچواں دن تھا کہ چھٹا مسلسل فاقے سے ہم دونوں کی حالت غیر ہو گئی۔ اب زندہ رہنے کی ایک ہی سبیل تھی کہ کچھ کھانے کو ملے اور کھانے کے لئے عزیز قاری! جیسا آپ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں' موجودہ حالات میں مردم خوری کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا مگر ہم دو ہی تو مردم تھے میں اور کیپٹن بلال۔ تخن گسترانہ بات اس مسئلہ میں آپڑی کہ کون کس کو کھائے اور اس مسئلے کو ہم نے کمال خیرسگالی کے جذبے سے حل کیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ ایک دوسرے سے دست گریباں ہو کر ناحق کھانے کا ذائقہ خراب کر دیتے۔ ہم نے شریفانہ طور پر قرعہ اندازی کا فیصلہ کیا۔ کیپٹن بلال نے دو کاغذ کے ٹکڑے لئے۔ ایک پر لکھا ''کھانے والا'' اور دوسرے پر ''کھایا جانے والا'' پھر ان کاغذ کے ٹکڑوں کو پیٹی کے نیچے چھپا دیا اور مجھے کہا ''بہرام۔ اپنی آنکھیں بند کرو اور ایک ٹکڑا نکال لو۔''

میں نے خدا کو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے پیٹی کے نیچے سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ کیپٹن بلال نے امید و یاس کے درمیان کانپتے کانپتے پوچھا کیا لکھا ہے اس کاغذ پر؟'' میں نے پڑھنے کی بجائے کاغذ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ اور ہم دونوں نے بیک وقت پڑھا ''کھانے والا''

کیپٹن بلال نے ایک دردناک آہ بھری اور شرافت سے اپنے آپ کو پلیٹ میں رکھ دیا۔

میرے خیال میں اب اس کہانی کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ قانونِ قدرت ہے کہ صحت کا انحصار خوراک پر ہے، چنانچہ رفتہ رفتہ میری صحت بہتر ہونے لگی۔ میری رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا اور میرے اعضاء میں وہ طاقت عود کر آئی جو مسلسل فاقے سے تقریباً تباہ ہو چکی تھی۔ یہ تھے دن، عزیز قاری آرام وسکون کے لیکن میں جب بھی انہیں یاد کرتا ہوں، اس بہادر کپتان کی یاد میں ایک دو آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ عیش و آسائش اسی شخص کی قربانی کا نتیجہ تھا۔

چار پانچ روز مزید گزرے ہوں گے کہ مجھے اپنے بیڑے کے کسی ساحل سے ٹکرانے کا احساس ہوا اور میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا، غور سے جو دیکھا تو ایک جزیرہ تھا۔ جو شکل میں گول سا تھا اور جس کا ساحل ریتلا اور نشیبی سا تھا۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ جزیرہ کچھ مانوس سا لگ رہا ہے۔ پھر اچانک میرا حافظہ پوری طرح جاگ اٹھا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''خزانے والا جزیرہ! آخر مل گیا مجھے میری محنت کا ثمرہ!!''

میں تیر کی طرح اڑتا ہوا جزیرے کے مرکز میں پہنچا جہاں نقشے کے مطابق ایک سوٹ کیس میں پانچ لاکھ سنہری پونڈ مدفون تھے مگر کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ایک تازہ کھدا ہوا گڑھا ہے جس میں ایک سوٹ کیس تو پڑا ہے لیکن بالکل خالی! سب سنہری پونڈ غائب ہیں۔ ساتھ ہی گڑھے کے کنارے کسی نے ایک تختہ گاڑ دیا تھا اور تختے پر جلی الفاظ میں لکھا تھا۔

''سفینۂ مسرت۔ اکتوبر 1867ء

تو یہ ہمارے جہاز سفینۂ مسرت کے ملاحوں کی ہی کارستانی تھی! بدمعاشوں نے کیپٹن بلال اور میرے رخصت ہونے کے بعد جہاز کی مرمت کر لی تھی اور سیدھا خزانے والے جزیرے کا نقشہ ساتھ لانے کی بجائے میز پر کھلا چھوڑ آئے تھے۔ چنانچہ ملاحوں نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی خزانہ لُوٹ لیا اور دل جلانے کے لئے یادگاری تختی بھی نصب کر گئے تھے۔ اس خیال نے کہ بعض ماتحت لوگ کتنے ناشکرے ہوتے ہیں مجھے بے حال کر دیا اور میں نڈھال ہو کر ریت پر چت گرا۔

اب یہ جزیرہ ہی میرا مسکن تھا اور مجھے اسی پر گزر اوقات کرنا تھا لیکن یہاں ریت اور کیچڑ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں، چنانچہ ناچار ریت اور کیچڑ پر ہی گزر اوقات کرنے لگا۔ نتیجہ ظاہر ہے میری صحت پھر تیزی سے گرنے لگی اور پھر جیسا کہ اس ناقص غذا کے بعد ناگزیر تھا میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور ایک دن قضائے الٰہی سے میرا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد کیا رہ گیا تھا! بس جوں توں کر کے اپنی قبر کھودی اور تنِ تنہا دفن ہو گیا۔

قارئین یہ ہے میری غم ناک مگر سچی داستان۔ دوسرے جہاز رانوں کی کہانیاں بھی غمناک تو بہت ہوتی ہیں مگر ان میں اکثر مبالغہ ہوتا ہے۔ خدا کرے آئندہ یہ لوگ میری مثال سے فائدہ اٹھائیں۔ کیا سچ کہا ہے شاعر نے۔

سچائی عجب چیز دنیا میں ہے
سچائی سے بڑھ کر نہیں کوئی شے

# وزیرِ چنیں

ایک تھا بادشاہ جیسے کہ بادشاہ ہوتے ہیں عالی جاں سخی داتا' زود رنج۔ جی چاہا تو کسی کو خلعت بخش دی اور جی چاہا تو توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا۔

اور ایک تھا وزیر با تدبیر بلکہ کائیاں اور چالاک۔ مجال ہے بادشاہت میں کوئی فتنہ سر اٹھائے منٹوں میں کچل کر رکھ دیتا۔ پھر اپنی شہرت کے اعتبار سے دل کا سچا اور قول کا پکا اور خدا ہی جانے کیا کیا کچھ۔ اتنی خوبیوں کا وزیر ہو تو بادشاہ کی مسرت کا کیا ٹھکانا۔ مگر ذرا جہاں پناہ کی اس حیرت کا اندازہ بھی کریں جب ایک روز حضور کیا دیکھتے ہیں کہ وزیرِ موصوف شاہی خزانے سے ایک بوری زر و جواہر سے بھر کر، پیٹھ پر ڈالے، چپکے سے دروازے سے نکل رہے ہیں۔ شاہی غضب کا پارہ حسب معمول ایک لمحے میں کھولاؤ کے درجے پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے میں آپ نے تالی بجائی اور اگلے لمحے میں شاہی حفاظتی دستہ حاضرِ خدمت ہو گیا جلالت مآب نے کمانڈر کو حکم دیا کہ وزیر کا سر فی الفور قلم کر دیا جائے۔

وزیر نے فرمان شاہی سنا تو براہِ راست بادشاہ کے قدموں پر جا گرا اور شاہی گھٹنے تھام کر عرض پرداز ہوا ''رحم' میرے آقا رحم۔ میرا قصور معاف فرمائیں کہ میں کوئی عادی چور نہیں ہوں۔

آج کی لغزش محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ میں گنہگار سہی لیکن ظل الٰہی۔ مجھے اتنی رعایت ضرور دیجیے جتنی نائی نے حکیم کے ساتھ کی تھی۔"

"یہ نائی اور حکیم کا کیا قصہ ہے؟" بادشاہ نے پوچھا "مگر قصہ شتابی سے بیان کرو کہ تمہارا قتل زیادہ دیر ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔"

## قصہ نائی اور حکیم کا

"ایک تھا نائی جہاں پناہ!" وزیر نے قصہ شروع کیا "جس کا دعویٰ تھا کہ اس کے پاس گنجے سر پر بال اُگانے کا نسخہ ہے۔ نسخے میں تو خیر کچھ نہ تھا مگر نائی تھا بے حد چرب زبان۔ کسی گاہک کو نسخہ خریدے بغیر نہ جانے دیتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ شہر کے امیروں میں شمار ہونے لگا اور بڑا منہ زور ہو گیا۔ ایک روز ایک حکیم کہ بال اس کے سر کے پتلے تھے نائی کی دکان پر حجامت کرانے آیا۔ نائی نے حسبِ معمول اپنا نسخہ اس کے سر بھی تھوپنا چاہا۔ مگر حکیم بولا "دیکھو نائی: میں حکیم ہوں، یہ چال بازی کسی اور سے کرنا۔ تمہارے نسخے میں پانی اور رنگ کے سوا کچھ نہیں۔"

اس پر منہ زور نائی نے حکیم کو غضب سے دیکھا اور اس کی شہ رگ پر استرا رکھ کر بولا "تم شریف نائیوں کی دیانت پر شبہ کرتے ہو۔ سو تیار ہو جاؤ میں تمہاری گردن کاٹنے لگا ہوں۔ بولو! آگے سے کاٹوں یا پیچھے سے۔"

"ٹھہرو! میرے پیارے نائی" حکیم نے لجاجت سے کہا "میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ رحم کرو اس غریب پر کم از کم اتنا رحم جتنا جن نے معمار پر کیا تھا۔"

"کیا قصہ ہے جن اور معمار کا۔" نائی نے استرا ہٹاتے ہوئے پوچھا "جلد سناؤ کہ میں بہت مہلت نہیں دے سکتا۔؟"

## قصہ جن اور معمار کا

"محترم نائی" حکیم نے آغاز کیا "ایک تھا معمار، دیانتدار، محنت شعار اور انجمنِ معماراں کا

رکنِ وفاداریعنی قواعدِ انجمن کے مطابق ایک دن میں ایک سو سے زائد اینٹیں کسی صورت میں نہیں چنتا تھا۔ مگر ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ کام ختم کرنے کے بعد جب تعمیر کردہ دیوار کی اینٹیں گنیں تو ایک سو تین نکلیں۔ انجمن کی نافرمانی کے ڈر سے اس نے فوراً تین اینٹیں اکھاڑیں اور دور ہوا میں پھینک دیں۔ مگر تیسری اینٹ کا پھینکنا تھا کہ ایک دہشت ناک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی ایک دیو قامت جن نمودار ہوا۔

''ذلیل معمار'' جن چلایا'' تم نے اینٹ پھینک کر میری آنکھ پھوڑ دی اب تیار ہو جاؤ میں تمہارا سر پھوڑتا ہوں'' یہ کہہ کر اس نے اپنا گرز اٹھایا۔

''رحم میرے پیارے جن، رحم'' معمار نے ہاتھ جوڑ کر کہا'' میں نے تمہاری آنکھ جان بوجھ کر نہیں پھوڑی۔ میں اتنے رحم کا ضرور مستحق ہوں جتنا خاتون نے اپنے جھگڑالو شوہر پر کیا تھا۔''

''یہ کیا قصہ ہے؟'' جن نے گرز زمین پر ٹیکتے ہوئے پوچھا۔'' چلو بیان کرو قصہ بیان کرنے تک تم زندہ رہ سکتے ہو۔

## قصہ خاتون اور اسکے جھگڑالو شوہر کا:

''ایک تھا نوجوان'' معمار نے قصہ شروع کیا'' لکھا پڑھا تو ایسا نہ تھا۔ مگر بے حد چالاک تھا۔ اس نے کچھ محنت بھی کی مگر محنت سے زیادہ چالاکی سے بے شمار دولت جمع کر لی اور دھوکے سے ایک ایسی خاتون سے شادی کر لی جو حسن ہی میں نہیں دانائی میں بھی یکتا تھی بلکہ جنات پر بھی قدرت رکھتی تھی۔ شادی کے پہلے چند ماہ تو پُر لطف گزرے مگر کم ظرف شوہر رفتہ رفتہ اپنی بیوی کی برتری سے جلنے لگا۔ اور اس بات پر تو وہ بھڑک ہی اٹھا جب اس خاتون نے شاہی کونسل کی ممبری کی درخواست دے دی۔ کیونکہ گھر میں بیکار بیٹھنے کی بجائے اس نے کاروبارِ مملکت میں حصہ لینے کو ترجیح دی۔ ایک دن غصے میں آکر بیوی سے کہنے لگا'' زلیخا' کیا شاہی نوکری سے بہتر یہ نہیں کہ تم گھر کے کام میں دلچسپی لو اور اپنے مجازی خدا کے آرام کا خیال رکھو؟'' ایک نکمے خاوند کے منہ سے یہ ہتک آمیز کلمہ سن کر خاتون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی'' اب تم ناقابل برداشت ہو چلے ہو

مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔" اور ساتھ ہی اپنی ایک انگوٹھی دوسری پر رگڑی۔ اس پر فی الفور ایک پہاڑ سا حبشی نمودار ہوا اور خاتون سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "غلام حاضر ہے۔ کوئی حکم"؟

خاتون نے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حبشی سے کہا "اس بدتمیز شخص کو شہر کے سب سے اونچے مینار پر لے جاؤ اور وہاں سے نیچے پھینک کر اس کا چورا کر دو۔"

اس پر حبشی آگے بڑھا مگر شوہر دست بستہ بیوی سے مخاطب ہوا۔ "رحم، نیک خاتون رحم، کم از کم اتنا رحم اس بدنصیب پر ضرور کرو جتنا درویش نے مسخرے پر کیا تھا۔"

"کیا کیا تھا درویش نے مسخرے کے ساتھ؟" خاتون نے حبشی کو تھمنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اور ہاں کہانی بیان کرنے کے لئے تمہیں صرف دو منٹ دیتی ہوں۔"

## کہانی درویش اور مسخرے کی:

شوہر بولا "ایک درویش ایک لمبے سفر کے بعد ایک اجنبی شہر میں وارد ہوا۔ سخت بھوکا اور پیاسا تھا۔ ایک نوجوان سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس سے بولا "نوجوان، کسی ایسی دکان کا پتہ بتا سکتے ہو جہاں مجھے کچھ کھانے پینے کو مل جائے؟" نوجوان بولا "آؤ میرے ساتھ۔" اور پھر اسے ایک علیشان عمارت میں لے گیا۔

"کیا یہی ہے وہ جگہ جہاں سے مجھے کچھ کھانے پینے کو ملے گا؟" درویش نے بے تاب ہو کر پوچھا "نہیں یہ تو عجائب گھر ہے میں نے سوچا تمہیں یہ مشہور جگہ دکھا دوں۔" نوجوان نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا، وہ دراصل اپنے مسخرہ پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

درویش بولا "بے شک نہایت عمدہ عمارت ہے مگر مجھے شدت کی پیاس لگ رہی ہے۔ اگر شربت یا پانی کی دکان....."

"فکر نہ کرو بابا" نوجوان بولا "چلو میرے پیچھے پیچھے۔" اور کوئی میل بھر فاصلہ کرنے کے بعد نوجوان ایک محراب کے قریب رکا۔ کہنے لگا "دیکھتے ہو یہ عظیم الشان محراب بابا؟ یہ ہماری فوج کی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کی گئی تھی۔ ہمیں اس پر بڑا فخر ہے۔"

''بے شک'' درویش نے تائید کی'' مگر میرے عزیز پیاس نے میرا برا حال کر رکھا ہے۔ اب کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں پانی کا گلاس مل سکے۔

نوجوان بولا! ضرور' چلو اُدھر ہی چلتے ہیں اور پھر ایک طویل مسافت کے بعد شہر کے باہر ایک اونچے ٹیلے پر لے گیا۔ درویش بولا!'' مجھے تو یہاں پانی وانی کچھ نہیں نظر آتا۔ مگر نظارا کتنا دلربا ہے!'' نوجوان نے اپنے آپ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

درویش کا صبر جواب دے گیا اس نے اپنے تھیلے سے ایک تیغ نما چھرا نکالا اور نوجوان کو بازو سے پکڑ کر بولا'' بدذات مسخرے ٹھہر' میں تیری کھوپڑی چیرتا ہوں۔''

مسخرے نے چھرا دیکھا تو چلایا'' میرے اچھے درویش بابا۔ مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ مجھ پر کم از کم اتنا رحم ضرور کرو جتنا زیتون فروش نے چور پر کیا تھا۔''

''یہ کیا قصہ ہے؟'' درویش نے پوچھا

لیکن اس مقام پر بادشاہ نے وزیر کو ٹوکا اور کہا'' اب میں تمہاری چال کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ یہ قصے ختم کرنے کے لئے تمہیں کتنا وقت درکار ہے'' وزیر بولا'' جہاں پناہ! یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کتنے گھنٹے روزانہ مجھے قصہ سنانے کے لئے دے سکتے ہیں۔ ابھی تو میں تمہید کی منزل میں ہوں۔''

بادشاہ بولا'' منصوبہ تو تمہارا برا نہیں۔ تم غالباً یہ کہنا چاہتے ہو کہ اتنا وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ تمہیں معاف ہی کر دیا جائے۔''

''بے شک۔ میرے دانا بینا بادشاہ'' وزیر نے دست عرض کیا'' یہی اس ناچیز کا مدعا ہے۔''

''مگر کیا تمہارا سرفی الفور اڑا دینے سے بھی وقت کی اتنی ہی بچت نہ ہوگی؟'' بادشاہ نے وزیر سے پوچھا۔

''بے شک میرے مالک'' وزیر بولا'' مگر شتربانوں کی ہڑتال کی خبریں آرہی ہیں۔ اگر انہوں نے سچ مچ ہڑتال کر دی تو ملک میں ٹرانسپورٹ کا انتظام درہم برہم ہو جائے گا اور شاید

جہاں پناہ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی کہ انجمن شتر باناں کا امیر بڑا ظالم آدمی ہے۔"

بادشاہ بولا "ٹھیک ہے" ہڑتال کی بھی افواہ ہے مگر تمہاری "اضطراری حرکتوں" سے خزانہ ہی خالی ہو گیا تو ہماری بادشاہی کا کیا فائدہ؟"

"جلالت مآب" وزیر نے عرض کیا "خزانہ تو ایک معمولی ٹیکس سے دوبارہ بھرا جا سکتا ہے۔لیکن حضور کو کوئی گزند پہنچ گیا تو بھرے خزانے کا کیا فائدہ؟"

بادشاہ سلامت نے پہلی دفعہ اپنی جان کے حوالے سے معاملے پر غور کیا اور فی الفور اس کی تہہ تک پہنچ گئے۔بولے "بخدا وزیراعظم، تم ٹھیک کہتے ہو۔جاؤ تم آزاد ہو مگر شتر بانوں کے امیر کا کچھ کرنا پڑے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں میرے آقا" وزیر نے بادشاہ کا دامن چومتے ہوئے کہا اور یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔اگلے لمحے وزیر نے انجمن شتر باناں کے نائب امیر کو طلب کیا اسے پروموشن کا لالچ دیا اور ساتھ ہی ایک اہم کام اسے سونپا۔نائب امیر نے وزیراعظم کے دامن کو بوسہ دیا اور نصف گھنٹہ بعد شتر بانوں کے امیر کا سر کاٹ لایا۔وزیراعظم نے یہ تحفہ بادشاہ کی خدمت میں گزار دیا اور پھر بادشاہ اور وزیر دونوں ہنسی خوشی بادشاہی اور وزیری کرنے لگے اور مدتوں کرتے رہے۔

# بالائی منزل کا اجنبی

شہوار نے پیانو بجاتے ہوئے محسوس کیا کہ جونہی اس نے سُر نکالی اوپر کے کمرے کے مکین نے کمرے کے چوبی فرش پر پاؤں سے تال بجانا شروع کر دیا۔ تھپ' تھپا تھپ ....

ابتدا میں تو شہوار کو یہ محض ایک ناگوار سی حرکت لگی لیکن رفتہ رفتہ اس تھپا تھپ کے تواتر نے ایک عذاب کی شکل اختیار کر لی۔ جونہی وہ پیانو کے پردوں پر اپنی نازک انگلیوں سے ایک خوبصورت سُر نکالتی، اوپر کی چھت سے تھپا تھپ کی پُر شور تال سنگت کرنے لگتی اور شہوار کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے دماغ سے، کوئی سرخ تپتے نشتر سے موسیقی کھرچ رہا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ اس ذہنی اذیت کے علاوہ اس کی بے آبروئی پر تُل گیا ہو۔ ''یقیناً یہ کوئی وحشی ہوگا''۔ وہ بار بار دہراتی......اور پھر غصّے سے چور ہو کر شہوار نے پیانو کے پردوں پر کومل انگلیاں چلانے کی بجائے انہیں تھپڑ دے مارا اور پیانو کی گونجتی گرجتی سُریں چھت سے جا ٹکرائیں مگر اوپر سے کیا جواب آیا؟ اتنے ہی زور کی تھپا تھپ، تھپا تھپ، تھپا تھپ۔

یہ شہوار کی پشت پر آخری تنکا تھا۔ وہ یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ دانت بھینچے ہوئے، آنکھوں میں انگارے اور سانسوں میں شرارے۔ وہ کمرے سے نکلی اور

---

The man upstairs By P.G wodehouse

سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اگر کوئی دیکھنے والا ہوتا تو اس کم نصیب شخص پر ترس کھائے بغیر نہ رہتا جو اس سیڑھیاں چڑھتی قیامت سے بے خبر اپنے کمرے میں پاؤں سے تال بجا رہا تھا۔ اگلے لمحے میں قیامت نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی:

''آپ' تشریف لائیے''

شہوار کو یہ لہجہ خلافِ توقع ملائم لگا لیکن اس ملائمت کا فائدہ! جب صاحب لہجہ' عادت کا اتنا ہی پاجی اور اس کی اچھل کود اتنی نا ملائم ہو؟ بہر حال دروازہ کھلا اور شہوار اندر داخل ہوئی۔ بڑا سادہ سا کمرہ تھا۔ نہ کوئی فرنیچر نہ قالین۔ بس ایک سہ پائی پر تصویر کشی کے لئے تختہ رکھا تھا جس کی اوٹ میں وہ کھڑا تھا جیسے تصویر بنا رہا ہو مگر فی الوقت اس کی ٹانگیں ہی نظر آ رہی تھیں یا تختے کے سرے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے یعنی موصوف سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ شہوار نے غصّے پر قابو رکھتے ہوئے حسبِ دستور ابتدائے کلام کی......

''معاف رکھنا......''

مگر پیشتر اس کے کہ کچھ مزید کہہ پاتی' وہ تختے کے پیچھے ہی سے بولا ''مجھے اس وقت کوئی نئی ماڈل نہیں چاہئے۔ اپنا کارڈ میز پر چھوڑ جائیے۔''

شہوار پوری بے اعتنائی سے بولی ''میں ماڈل لڑکی نہیں ہوں' میں تو آئی ہوں کہ......''

اس پر وہ وحشی بورڈ کے پیچھے سے نکل کر سامنے آیا منہ سے پائپ نکالا اور شہوار کو کرسی پیش کرتے ہوئے بولا ''معافی چاہتا ہوں۔ آپ تشریف رکھیئے نا۔''

قدرت اپنے انعامات تقسیم کرنے میں بھی کس قدر بے پروا ہے۔ ذرا اس پاؤں پٹخنے والے وحشی ہی کو دیکھیں۔ اس کی آواز کتنی پیاری تھی۔ اس کا سراپا کس قدر دلکش تھا۔ اس کے سر کے بال وقتی طور پر ضرور الجھے ہوئے تھے اور ایک آوارہ سی لٹ اس کے ماتھے پر کھڑی تھی مگر اس کے باوجود وہ کتنا خوبرو لگ رہا تھا...... ان باتوں کا اعتراف شہوار نے دل ہی دل میں کیا۔ غصّے کی بات الگ ہے ورنہ شہوار تھی انصاف پسند...... بہر حال شہوار کھڑی رہی۔ چپ رہی اور اجنبی

دوبارہ معذرتی انداز میں بولا ''میں معافی کا خواستگار ہوں۔ میں سمجھا پھر کوئی ماڈل لڑکی نازل ہوئی ہے۔ جب سے یہاں آیا ہوں یہ ماڈل لڑکیاں دس فی گھنٹہ کے حساب سے آنے لگی ہیں۔ شروع شروع میں تو میں نے پروانہ کی مگر جب اس نئی نسل کی اکیسویں بنی نے قدم رنجہ فرمایا تو میرا صبر جواب دے گیا۔''

شہوار کوئی دلچسپی دکھائے بغیر اجنبی کی کہانی سنتی رہی۔ جب سن چکی تو انتہائی سرد لہجے میں بولی ''معاف کرنا میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ کہیں میرا پیانو بجانا تو آپ کے کام میں خلل انداز نہیں ہوا۔ میں نچلے کمرے میں رہتی ہوں اور آپ کے پاؤں پٹخنے کی آوازیں سنتی رہتی ہوں۔''

جس سرد مہری سے شہوار نے سوال کیا اسے کوئی اسکیمو ہی برداشت کر سکتا تھا۔ مگر اس شخص پر کوئی اولہ تک نہ گرا۔ بڑی خوشدلی سے بولا ''نہیں نہیں' آپ خلل کی بات کرتی ہیں۔ مجھے تو آپ کی موسیقی اچھی لگتی ہے۔ سچ مچ اچھی۔''

''اگر اچھی لگتی ہے تو سنتے ہی فرش پر پاؤں مارنا کیوں شروع کر دیتے ہیں؟'' شہوار نے اپنے کمرے کی طرف چلتے چلتے اپنی شکایت جاری رکھی۔'' آپ کا فرش پیٹنا یہ میرے لئے صحت بخش ہے نہ میری موسیقی کے لئے۔ امید ہے آپ میری صاف گوئی کا برا نہیں مانیں گے۔ خدا حافظ۔''

نوجوان جھٹ بولا'' بالکل برا نہیں مانوں گا مگر ذرا ٹھہریں تو۔''

شہوار رک گئی اور نوجوان ایک دوستانہ تبسم کے ساتھ اس کا جائزہ لینے لگا۔ ہر چند کہ شہوار کو اس کی مسکراہٹ نے ذرا مسحور سا کیا تاہم ایک بات پر اسے غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس کی کٹیلی شکایت کے باوجود وہ بالکل پُرسکون تھا۔ گھبراہٹ نے اسے چھوا تک نہ تھا حالانکہ شہوار کے خیال میں اسے اپنی بدتمیزی پر شرمسار ہو کر ڈوب مرنا چاہئے تھا۔ بہر حال شہوار کا جائزہ ختم کر چکا تو بولا۔'' دیکھیں معافی تو میں ایک بار پھر مانگ لیتا ہوں کہ مجھے موسیقی سے عشق ہے لیکن ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھیں'' شہوار نے آرام سے کہا

''وہ جو کچھ آپ پیانو پر بجا رہی تھیں کوئی لمبی با معنی دھن تو نہ تھی۔ بس ایک چھوٹا سا ''سا۔رے۔گا'' کا ٹکڑا بار بار دہرا رہی تھیں۔''

''میں دراصل ایک ٹکڑے ہی کی مشق کر رہی تھی۔'' شہوار نے جواب دیا۔ شہوار کے لہجے میں وقار تو وہی تھا مگر تلخی خاصی کم تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی سردمہری بتدریج پگھل رہی ہو۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس پراگندہ مولونڈے کی باتوں میں کچھ عجیب قسم کی حرارت تھی۔

نوجوان نے حیرت سے پوچھا ''بس ایک ٹکڑے ہی کی مشق فرما رہی تھیں؟''

''ہاں' ہاں!'' شہوار نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''پوری دھن کے ایک ٹکڑے کی۔ دراصل میں ایک رقص کی دھن تیار کر رہی ہوں۔''

یہ سنا تو نوجوان کا چہرہ شہوار کی تحسین میں ٹمٹما اٹھا۔ اگر شہوار کے دل میں برف کی چھوٹی سی ڈلی باقی تھی تو وہ بھی پگھل گئی۔ دراصل شہوار کو یقین سا ہو گیا کہ یہ فرش پہننے والا ''بدقماش'' تو خاصا پیارا سا آدمی ہے۔

اُدھر شہوار بھی نوجوان کو کچھ کم پیاری نہیں لگ رہی تھی۔ شہوار سے پوچھنے لگا ''تو کیا آپ سچ مچ موسیقار ہیں؟''

ایسی بڑی موسیقار تو نہیں بس دو چار دھنیں بنائی ہیں۔'' شہوار کے انداز گفتگو میں پہلی بار مسکراہٹ کا شبہ سا تھا یا یوں کہیں کہ غصہ نہ تھا۔

نوجوان مرعوب مگر مسرور انداز میں بولا ''بھئی' یہ گانوں اور رقص کی دھنیں بنانا تو بڑے کمال کی بات ہے۔ آپ تو ماشاءاللہ فنکار ہیں' آرٹسٹ!''

''فنکار تو آپ بھی ہیں۔ آپ مصوری کرتے ہیں۔ شہوار نے خوشدلی سے خراج لوٹایا۔

نوجوان بولا ''میری فنکاری تو فی الحال اس چھوٹی سی تصویر پر مشتمل ہے جو بنا رہا ہوں۔ ویسے جی تو یہ چاہتا ہے کہ پورے گھر کے در و دیوار پینٹ کیا کروں۔ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے۔''

شہوار بولی" ذرا مجھے اپنی پینٹنگ تو دیکھنے دیں" اور یہ کہہ کر وہ سہ پائی کے سامنے کی طرف بڑھنے لگی" بھئی کیوں پردہ چاک کرتی ہیں میری مصوری کا؟" نوجوان نے ذرا احتجاجاً کہا" مگر آپ تُل ہی گئی ہیں تو چلیں دیکھیں میری پینٹنگ۔"

ایک گھاگ نقاد کو تو یہ پینٹنگ خاصی بچگانہ بلکہ بھونڈی سی لگتی۔ تصویر میں ایک سیاہ چشم بچہ تھا جس نے ایک بڑی سی کالی بلی اٹھا رکھی تھی۔ ماہرین شماریات کا اندازہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرتا کہ کرۂ ارض پر کہیں نہ کہیں نو آموز آرٹس بلی اٹھائے ہوئے بچے کی تصویر نہ بنا رہا ہو۔

نوجوان نے اپنا تعارف تو ابھی نہیں کرایا تھا مگر اپنی تصویر کا تعارف کرانے لگا" میری اس تصویر کا عنوان ہے" بچہ اور بلی۔" ہے نا سادہ اور عام فہم عنوان؟ فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ پینٹنگ کس چیز کی ہے۔"

ساتھ ہی اس نے اپنے پائپ سے تصویر میں بلی کو مس کرتے ہوئے کہا" یہ بلی ہے۔"

شہوار کا کسی تصویر کو پسند یا ناپسند کرنے کا ایک ہی معیار تھا کہ تصویر دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے یا ناخوش۔ وہ غالباً دنیا بھر کی لاکھوں" بلی اور بچہ" والی تصویروں میں سے کسی ایک کو بھی برا نہ کہتی۔ پھر نوجوان نے تو اس کی موسیقی کو سراہا بھی تھا۔ فوراً بولی" بڑی پیاری تصویر ہے۔"

نوجوان کے چہرے سے خوشی سے زیادہ حیرت ٹپکنے لگی۔ بولا" اگر آپ واقعی دل کی بات کہہ رہی ہیں تو میں خوشی سے مر سکتا ہوں مگر ایک شرط پر اور شرط یہ ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے اپنے کمرے میں آنے اور اپنی موسیقی سننے کی اجازت دیں۔"

شہوار بولی" اگر میں نے اجازت دے دی تو پھر میرے کمرے کے فرش کی شامت آجائے گی۔ آپ تو پیانو کی پہلی آواز پر ہی پاؤں پٹخنا شروع کر دیں گے!"

"میری توبہ" نوجوان نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔" میں زندگی بھر کسی فرش پر پاؤں نہ پٹخوں گا۔"

پنڈی میں دوستیاں نہایت پھرتی سے پھلتی پھولتی ہیں۔ چند ابتدائی باتوں سے شہوار کو معلوم ہو گیا کہ نوجوان کا نام سلمان ہے اور یہ کہ اس کا گزارا محض مصوری پر نہیں' اچھے کھاتے پیتے گھر کا چشم و چراغ ہے...... دراصل یہ شخص شہوار کو گفتگو کے پہلے کلمے ہی سے اچھا لگا تھا۔ شہوار نے بہت سے ناکام مصور دیکھے تھے مگر سلمان ایک بالکل ہی نرالی قسم کا ناکام مصور تھا۔ مثلاً اسی عمارت میں ایک اور مصور رشامی کا بھی سٹوڈیو تھا اور یہ شخص کبھی کبھی شہوار کے ہاں بھی ٹپک پڑتا جہاں اس کی کافی پیتا اور عوام کی بدذوقی اور جہالت پر لعنت برساتا کہ وہ لوگ اس کی بنی ہوئی تصاویر نہیں خریدتے تھے۔ ادھر سلمان کی تصاویر کا بھی کوئی گاہک نہ تھا مگر جب شہوار نے اسے ازراہِ ہمدردی کہا کہ ''دل چھوٹا نہ کرو۔ ابھی تم مبتدی ہو اور عوام بھی آرٹ کے معاملے میں کسی قدر کورذوق ہیں'' تو سلمان نے جھٹ احتجاج کیا۔ بولا ''نہیں نہیں'' مس شہوار' عوام کو الزام نہ دو یہ بڑے قدردان لوگ ہیں۔ کوئی خرابی ہے تو ہماری تخلیقات میں ہے اور میں خود تو ابھی ہوں ہی اناڑی۔''...... بس' سلمان کے اس جملے نے شہوار کا دل جیت لیا۔ سلمان کسی دوسرے طریقے سے یعنی تعریف یا خوشامد سے شہوار کے دل تک نہ پہنچ پاتا۔ سلمان نے بات ہی شہوار کے دل کی کہی تھی۔ شہوار کو وہ آرٹسٹ زہر لگتے تھے جو اپنی ناکامی' گاہکوں کی بدذوقی کے نام دھرتے۔

دراصل شہوار محنت اور کوشش کی قائل تھی۔ قسمت کی بھی تھوڑی سی شکایت کر لیتی کہ یہ بھی بعض اوقات نوآموز مگر ہونہار فنکاروں کو کچوکے لگاتی ہے لیکن کبھی دوسروں کے سامنے گلوں شکوؤں کا دفتر نہ کھولتی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ناشرانِ موسیقی کے دفتروں سے اپنی دھنیں بیچنے میں ناکام لوٹی اور دل ہی دل میں ان پر ہزار لعنتیں بھیجیں بلکہ گھر آ کر رو رو کر تکیہ گیلا کر لیا مگر دوستوں کی مجلس میں کبھی قسمت کو کوسا نہ ناشروں کا رونا رویا۔ ہمیشہ ہشاش بشاش نظر آئی...... مگر آج' زندگی میں پہلی مرتبہ' سلمان کے آگے چھوٹے چھوٹے دکھڑے بیان کرنے لگی۔ دراصل سلمان میں ایک عجیب سی دردمندی کی حس تھی جو اس کے مخاطب کو حالِ دل کہنے کی دعوت دیتی تھی، چنانچہ شہوار نے پہلے تو ناشرانِ موسیقی کی سنگدلی کا قصہ سنایا۔ پھر یہ کہ اپنی جیب سے گانوں کی

دھنیں چھپوانا کس قدر مشکل ہے اور آخر میں یہ کہ گانے شائع ہو جائیں تو انہیں خریدتا کوئی نہیں۔

سلمان کو بے تکلفی کا احساس ہوا تو آپ سے تم پر آ گیا اور بولا:

''لیکن تمہارے وہ گیت تو یقیناً چھپ چکے ہوں گے جو تم پیانو پر بجاتی رہتی ہو۔''

''ہاں، بس تین چار گیت'' شہوار نے مایوسانہ سا جواب دیا۔

''تو انہیں خریدا کسی نے نہیں؟'' سلمان نے سوال کیا۔

''بمشکل چند کاپیاں بکی ہیں۔ بات یہ ہے کہ گیت وہی بکتا ہے جسے کسی اچھے گلوکار نے گایا ہو۔ مجھ سے دو چوٹی کے گویوں نے وعدہ بھی کیا تھا مگر پھر کنی کترا گئے۔ یہ بڑے بے اعتبار لوگ ہیں۔''

سلمان نے فوراً اپنے کھلنڈرے پن میں کہا ''ذرا مجھے ان گلوکاروں کے نام بتا دو۔ میں کل ایک ایک کر کے سب کو قتل کر ڈالوں گا''۔

شہوار خاموشی سے مسکرا دی۔''

سلمان پوچھنے لگا'' لیکن کیا تمہارے پاس اس مسئلے کا کوئی علاج نہیں؟''

''جی نہیں'' شہوار نے آہ بھری'' سوائے اس کے کہ کوشش کرتی رہوں، کرتی رہوں.....''

سلمان، شہوار کی آہ پر چونکا اور بولا'' اللہ، کس قدر بے بسی ہے مگر دیکھو زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ جب کبھی اداسی کا دورہ پڑے بھاگ کر میرے کمرے میں آ جانا اور اپنا تمام تر غصہ مجھ پر اتار لینا۔ غصہ پینا تمباکو سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور ہاں اگر تم اوپر نہ آ سکو تو مجھے نیچے بلا لینا۔ وہ ماہیا سنا ہے نا'' یا ہم کو بلا بھیجو یا آپ چلے آؤ''۔ اور مجھے بلانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ میز پر کھڑے ہو کر ایک لمبی چھڑی سے چھت کو کھٹکھنا دینا۔''

شہوار ہنس دی۔ اس پر سلمان جھٹ بولا'' بات ہوئی نا۔ ہنستے رہا کرو اور مجھ پر بھروسہ رکھو ایک فرش پینٹنے والا اسد حر جائے تو اس سے زیادہ وفا بندہ کوئی نہیں ہوتا۔ تو بتاؤ میرے پاس آؤ گے یا مجھے بلا لو گے نا؟''

شہوار سلمان کو غور سے تکتی رہی اور اس کی باتیں سنتی رہی۔ سلمان نے اپنا کلام جاری رکھا
''دیکھو مجھ پر جب کبھی مایوسی حملہ آور ہوتی ہے تو میں اس سے خلاصی پانے کے لئے باہر گلی میں نکل آتا ہوں اور نزدیک ترین پولیس والے کا گلا دبا کر دل ہلکا کر لیتا ہوں۔ تمہارے لئے یہ عمل شاید ممکن یا مناسب نہ ہو۔ لہٰذا کسی غم کے غالب آنے سے پہلے حسب ہدایت' کسی چھڑی سے چھت کو گدگدا دینا۔ اگلے لمحے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ پھر دیکھنا' الہ دین کا یہ جن تمہارے لئے کیا کچھ کرتا ہے!''

شہوار اسے اسی طرح غور سے تکتی ہوئی بولی ''سوچ لو تم ایسا وعدہ کر کے پچھتاؤ گے۔''...... شہوار بھی آپ سے تم پر آ گئی۔

''سوچ لیا۔ بالکل نہیں پچھتاؤں گا'' سلمان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
شہوار نے ذرا قرار محسوس کیا۔ بولی ''اگر یہ بات ہے تو مجھے اور کیا چاہئے؟ میں تو بعض اوقات ایک ایسے ہمدرد کی آرزو کرتی ہوں جو میری داستانِ غم سنے اور رو دے۔ وہ کیا کہا ہے غالب نے: مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں''

''غالب نے جو کچھ فرمایا ہے ٹھیک ہی ہوگا'' سلمان نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہارے لئے یاد رکھنے والی بات ایک ہی ہے کہ بوقت ضرورت میں کہاں پایا جاتا ہوں اور یہ مقام بالکل تمہارے کمرے کے اوپر والا کمرہ جس میں سے تمہیں پاؤں پٹخنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔''
شہوار مسکرائی اور ایک دوستانہ بے تکلفی کے ساتھ جھوٹ بول دیا'' میں نے تو ایسی کوئی آواز نہیں سنی۔''

شہوار نے یوں دھڑلے سے سلمان کا قصور بخش دیا تو وہ خوش ہو کر بولا ''تو پھر لاؤ ہاتھ!''
اگلے روز شہوار اپنی ایک غبی شاگرد کو موسیقی سکھاتے ہوئے اس قدر بیزار ہوئی کہ پیانو چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور سیڑھیوں کے رستے سلمان کے سٹوڈیو کا رخ کیا۔ دراصل شہوار کے شاگرد اس کا سرمایہ بھی تھے اور دردِ سر بھی۔ ان کی فیس اس کی زندگی کا سہارا بھی تھی اور خسارہ

بھی۔ بعض شاگرد تو سچ مچ گانا سیکھ رہے تھے مگر دوسروں کا صرف خیال تھا کہ وہ سیکھ رہے ہیں۔ ویسے ساری جماعت کی کھوپڑیوں میں مغز کی مقدار ایک چائے کے چمچے سے زیادہ نہ تھی اور یہ نالائق شاگرد جو سب سے آخر میں آئی، شہوار کی پشت پر آخری تنکا بھی ثابت ہوئی۔

شہوار، سلمان کے سٹوڈیو میں داخل ہوئی تو آگے شامی بھی آیا ہوا تھا اور سلمان کی زیر تکمیل پینٹنگ ''بچہ اور بلی'' کو تنقیدی نظروں سے گھور رہا تھا۔ شامی ایک بے ڈھنگا اور بدوضع سا شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی بخیل سی مونچھیں جیسے ہونٹ پر کوئلے کے دودھبے ہوں۔ وہ بے حد باتونی اور خود پسند تھا اور اسے دوسروں کی سرپرستی کا جنون تھا۔ شہوار کو ہمیشہ ''چھوٹی''' کہہ کر پکارتا تھا شہوار کی نگاہ میں وہ بحیثیت مجموعی ایک موذی قسم کا آدمی تھا۔

سلمان نے شہوار کو آتے دیکھا تو جھٹ بولا ''خوش آمدید شہوار۔ دیکھ لو یہ شامی صاحب میری ''بلی اور بچے'' کی تکہ بوٹی کرر ہے ہیں۔ اگر تم بھی اپنی کلہاڑی ساتھ لائی ہو تو اس قتلِ عام میں شریک ہونے کا بڑا سنہری موقع ہے۔''

شامی نے سلمان کا طنز ہضم کیا اور کسی قدر ناصحانہ انداز میں بولا ''سلمان میاں! میں تمہاری پینٹنگ کے فنی نقائص کی بات کرر ہا تھا۔ اگر میری تنقید تمہیں ناگوار گزری ہے تو معذرت چاہتا ہوں۔''

سلمان بدستور خوشدلانہ بولا: ''نہیں نہیں، شامی صاحب! آپ قتلِ عام، میرا مطلب ہے تنقید جاری رکھیں۔ یہ سب میرے فائدے کے لئے تو ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے'' شامی نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر کہا۔ ''میری رائے میں تمہاری پینٹنگ بے جان ہے۔ نہ بچے میں جان ہے اور نہ بلی میں زندگی کے آثار ہیں۔''

پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر، تصویر پر نظریں جماتے ہوئے بولا: ''یہ جو تمہاری بلی ہے، بلی یہ بلی، کیا کہنا چاہئے، اس کا......''

دراصل شامی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ چنانچہ سلمان درمیان میں بول اٹھا ''شامی

صاحب یہ اس نسل کی بلی نہیں جو آپ نے اپنے ذہن میں پال رکھی ہے۔''

ساتھ ہی شہوار پہلی دفعہ شریکِ گفتگو ہوئی۔''میرے خیال میں تو یہ بڑی پیاری بلی ہے۔''

شہوار نے بات تو بڑے سکون سے کہی مگر اندر سے ابل رہی تھی۔ خصوصاً اس لئے کہ سلمان نے شامی کی ہتک آمیز تنقید پر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا بلکہ سلمان نے تو اپنے مخصوص کسرِ نفسی کے انداز میں یہ بھی کہہ دیا:''بھئی' تم دونوں ایک بات پر تو متفق ہونا' کہ یہ بلی ہی کی تصویر ہے۔کوئی بھالو یا بھیڑ یا نہیں۔تو بس مجھ جیسے مبتدی کے لئے یہی بڑی کامیابی ہے۔''

شامی ایک مصنوعی شفقت کے لہجے میں بولا''بد دل مت ہو سلمان۔میری تنقید سے یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں بالکل ناکام سمجھتا ہوں۔وقت اور محنت کے ساتھ تم خاصے کامیاب مصور ثابت ہو سکتے ہو' خاصے''

شامی کی مشفقانہ' سرپرستانہ باتوں سے شہوار کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔سلمان کو مخاطب کرتے ہوئے بولی''مسٹر شامی کو بھی موجودہ علیشان مقام تک پہنچنے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ویسے تم نے مسٹر شامی کے شاہکار تو دیکھے ہوں گے' کیا غضب کی تصاویر ہیں!''

ایک لمحے کے لئے سلمان' شہوار کی بات پوری طرح سمجھ نہ پایا اور اس کے منہ سے ایک بے معنی جملہ نکلا''بات یہ ہے کہ دراصل مجھے معلوم نہیں کہ......''

''معلوم کیوں نہیں؟''شہوار نے الفاظ پیس پیس کر ابتدا کی''مسٹر شامی کے شاہکار مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔''

سلمان نے اس عظیم آرٹسٹ کی طرف حیرت اور تحسین کے ملے جلے جذبات سے دیکھا لیکن خود شامی' شہوار کا مدعا پا چکا تھا' چنانچہ اس کا چہرہ غصّے سے سرخ اور شرم سے زرد ہونے کے ساتھ ایک عجیب رنگ اختیار کر گیا تھا۔سلمان پھر بھی یہی سمجھا کہ یہ جینیس کا انکسار ہے۔

ادھر شہوار نے اپنا فقرہ مکمل کیا''جی ہاں' ان کے شاہکار تجارتی اشتہارات کی شکل میں ہر چھوٹے بڑے رسالے میں پائے جاتے ہیں۔مسٹر شامی نے باٹا شو اور حیات صوفے کی بڑی

نفیس تصویریں بنائی ہیں اور شیزان کے روسٹ مرغ کی تصویر تو اصل سے اس قدر ملتی ہے کہ اشتہار پر چھری کانٹا چلانے کو جی چاہتا ہے۔ دراصل مسٹر شامی ساکن اشیاء کی ڈرائنگ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔''

شہوار کی مہلک طنز سے اس چھوٹی سی مجلس پر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔ شامی بے چارا تو بالکل زمیں بوس ہو گیا اور سلمان کو سچ مچ یوں لگا جیسے ریفری ایک دو تین گن رہا ہو اور شامی ناک آؤٹ (knock out) ہونے کو ہو لیکن گنتی ابھی غالباً نو تک ہی پہنچی تھی کہ شامی نے اپنے حواس یک جا کئے اور بولا ''چھوٹی نے میرے آرٹ کے فقط تجارتی حصے کی بات کی ہے مگر میرے آرٹ کی ایک اور جہت بھی ہے۔ میری بڑے سائز کی لینڈ سکیپ پینٹنگ۔''

شہوار جھٹ بولی ''جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ عرصہ آٹھ ماہ کا ہوا آپ نے ایک سبزہ زار کا منظر مبلغ بیس روپے میں بیچا تھا اور اس سے پہلے ایک اور لینڈ سکیپ بھی آخر بک گئی تھی۔ اس سے غالباً آپ کو دس روپے کی یافت ہوئی تھی...... اور ہاں! میرا نام ''چھوٹی'' نہیں شہوار ہے۔'' شامی کے لئے یہ کافی پنائی تھی۔ بے چارے نے سرخم کیا اور کمرے سے خارج ہو گیا۔ ادھر سلمان نے شرارتاً ایک جھاڑن اٹھایا اور فرش پر جھاڑو دینے لگا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' شہوار نے حیران ہو کر پوچھا

''مرحوم شامی کے ٹکڑے اکٹھے کر رہا ہوں'' ۔سلمان نے جواب دیا۔ ''اب انہیں پورے اعزاز کے ساتھ دفنانا چاہئے۔ کیا غضب کا وار کیا شہوار' تم نے بھی!''

لیکن یہ سنتے ہی شہوار کے آنسو امڈ آئے اور اس قدر روئی کہ دریا بہا دیئے۔ اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپائے وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی اور لگی سسکیاں بھرنے۔

''یا اللہ یہ کیا ہو گیا!'' سلمان کے منہ سے نکلا

شہوار اب باقاعدہ چلانے لگی ''میں بالکل وحشی ہوں' درندہ' مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے۔ نفرت''

''یا اللہ خیر'' سلمان نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

''ہاں ہاں میں واقعی ظالم ہوں' سفاک' بے رحم''

''یا اللہ خیر!'' سلمان نے مزید بے بسی میں دہرایا۔

آخر شہوار ذرا سنبھلی تو سسکیاں بھرتی ہوئی اپنی غلطی کا اعتراف کرنے لگی۔ ''ہم سب لوگ اپنے کاموں میں جتے ہوئے ہیں مگر قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔ ایسے میں شامی کو کچھ ہمدردی دکھانے کی بجائے میں نے اسے طعنے دینا شروع کئے کہ اس کی تصاویر فضول ہیں یا بکتی نہیں۔ کیا کمینی حرکت کر دی میں نے۔ میرے اللہ مجھے اٹھا لے۔ میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔''

سلمان نے تیسری دفعہ وہی کلمہ دہرایا اور خاصے خضوع وخشوع کے ساتھ ''یا اللہ خیر۔''

شہوار کے حلق سے ہچکیوں کی ایک چھوٹی سی قطار برآمد ہوئی جو بتدریج مدھم ہوتے ہوتے بالآخر سکوت اختیار کر گئی۔ اب اس نے آنکھ کھولی۔ سلمان کو دیکھا اور ایک مسکین سی'' مرطوب سی مسکراہٹ پیدا کی۔

کہنے لگی'' سلمان میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھ سے بڑی حماقت ہوئی لیکن شامی کا انداز تمہارے متعلق اس قدر سرپرستانہ اور اتنا مکروہ تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور پھر اسے اس قدر نوچا کھسوٹا کہ کوئی جنگلی بلی بھی ایسا نہ کر سکے۔''

''نہیں نہیں تم کوئی بلی ولی نہیں ہو۔ بلی تو یہ ہے جو میری پینٹنگ میں بیٹھی ہے لیکن یہ بتاؤ کیا شامی بلکہ شامی مرحوم کوئی بڑا پینٹر نہیں؟ آج میرے سٹوڈیو میں بڑا اچھاتی پھلا کر داخل ہوا اور لگا میرے'' شاہکار'' میں کیڑے نکالنے۔ میں سمجھا بھئی عظیم آرٹسٹ ہے۔ کیڑے نکالنا اس کا حق ہے۔ سو ذرا برا نہ مانا مگر اب بتاؤ کیا وہ واقعی بڑا فنکار نہیں؟''

''کوئی بڑا فنکار نہیں'' شہوار بولی۔'' اس کا گزارا محض اشتہارات کے لئے تصویریں اور خاکے بنانے پر ہے لیکن میں نے بہر حال اسے طعنے دے کر اچھا نہیں کیا۔''

''اب بھول بھی جاؤ اس بات کو پلیز' شہوار'' سلمان نے التجا کی'' ہو گیا جو ہونا تھا''

'' کیسے بھولوں؟'' شہوار نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔'' میں اپنی بدتمیزی پر سخت شرمندہ ہوں۔'' سلمان صرف دو لفظ کہہ سکا'' اف خدایا۔''

شہوار اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی'' میں ابھی جا کر شامی سے معافی مانگوں گی۔ وہ مجھے ڈانٹے گا تو بری طرح' مگر جاؤں گی ضرور۔''

شہوار دروازے سے باہر نکلی سلمان نے اپنا پائپ سلگایا اور اپنے خیالوں میں گم' کھڑکی سے نیچے گلی میں دیکھنے لگا۔

زندگی کا ایک بڑا مفید اصول یہ ہے کہ کبھی معافی مت مانگو۔ معقول آدمی تو چاہتے ہی نہیں کہ ان سے کوئی معافی مانگے اور نامعقول لوگ معافی مانگنے والوں سے بڑی کمینگی سے پیش آتے ہیں۔ اب شامی تو پیدائشی نامعقول تھا۔ جب شہوار یکسر نادم و شرمسار اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ تو معاف تو اس نے کر دیا مگر یوں جیسے کوئی بادشاہ کسی مجرم کا گناہ بخش رہا ہو۔ شہوار ایسے سلوک کی عادی تو نہ تھی لیکن اسے اپنی غلطی کا ازالہ کرنا تھا۔ شامی کی ایک اور کمینگی برداشت کر لی اگرچہ اسے اب یہ خیال ستانے لگا کہ یہ بے ہودہ شخص پہلے سے بھی زیادہ شیر ہو جائے گا۔

شہوار کی پیشگوئی تقریباً درست نکلی۔ شامی نے شیر تو کیا ہونا تھا البتہ بھیڑیا ضرور بن گیا اور اب سلمان کے سٹوڈیو میں کثرت سے آنا شروع کر دیا۔ جونہی آتا سلمان کی پینٹنگ پر ......جواب تقریباً مکمل ہو چکی تھی...... جھپٹ پڑتا۔ شہوار یہ دیکھ کر حسب معمول کڑھتی اور دل ہی دل میں اس کا گلا گھونٹتی مگر خود سلمان مزے سے سگریٹ کے کش لگاتا رہتا اور ہنس دیتا۔ پینٹنگ میں تو شہوار کے نزدیک بھی کوئی خاص خوبی نہ تھی لیکن پینٹنگ کے خالق کے لئے شہوار کے دل میں ایک نرم سا گوشہ پیدا ہو گیا تھا (جس کے متعلق کبھی سوچنے لگتی تو ایک بے نام سی بے چینی بھی محسوس کرتی)۔ شامی کے ساتھ پچھلی جنگ کی یاد اس کے ذہن میں تازہ تھی ورنہ اس کی لغویات ہر لحظہ ایک دوسری جنگ کی دعوت دیتی تھیں۔ بے شک سلمان کوئی ایسا باکمال فنکار نہیں تھا مگر اسے

باکمال ہونے کا دعویٰ بھی نہ تھا۔ اُدھر شامی اپنی عادت سے مجبور' سلمان کی تصویر دیکھتے ہی اس بے دردی سے تیغِ زبان چلاتا کہ اگر انجمنِ انسدادِ بے رحمی حیوانات کا کوئی رکن ادھر آنکلتا تو شامی کو دھر لیتا۔ مگر خود سلمان اس کی ہر بدتمیزی پر مسکرا دیتا۔ اس کی یہ خوئے تسلیم شہوار کے لئے ناقابلِ فہم بھی تھی اور دردِ سر بھی۔

اور پھر اچانک شامی کے حالات میں ایک تبدیلی آنے لگی' ایک خوشگوار تبدیلی۔ اس کی تصاویر جو تصویر فروش کی دکان کے پچھواڑے میں ناکارہ جہازوں کی طرح اوندھی پڑی رہتی تھیں' بکنے لگیں۔ کوئی دو ہفتوں میں اس کی تین لینڈ سکیپ اور ایک علامتی تصویر خاصی معقول قیمت پر فروخت ہو گئیں۔ اتنی بڑی کامیابی پر شامی تو سچ مچ جامے سے باہر ہو گیا یعنی پرانے سوٹ پھینک کر نئے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس تھا اور اہم بات یہ کہ اب اس نے اپنی زہریلی تنقید کا کچھ جواز بھی پیدا کر لیا تھا۔ جب شیخ قادر بخش تصویر فروش نے اسے بتایا کہ اس کی علامتی تصویر' رنگ پورے کے ایک نوابزادے مسمّی ذوالفقار علی خان نے دس ہزار روپے میں خرید لی ہے تو شامی نے جو پبلک اور خصوصاً دولت مندوں پر لعنت برساتا رہتا تھا' ساری لعنت واپس لے لی اور نواب زادہ ذوالفقار علی خان کے حسنِ ذوق کے قصیدے پڑھنے لگا۔

شہوار نے شامی کی تصاویر کے بکنے کا سلمان سے ذکر کیا تو سلمان بولا: ''مجھے تو اس کہانی کا ایک اور پہلو زیادہ اہم لگتا ہے کہ بالآخر نوشوں کی نگری رنگ پور نے بھی کوئی ہوشمند آدمی پیدا کر لیا ہے ورنہ کوئی شرابی شامی کی اس علامتی تصویر کو گھاس نہ ڈالتا۔ شاباش رنگ پور!''

سلمان بھی بظاہر دنیائے فن میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی تصویر ''بچہ اور بلی'' مکمل کر چکا تھا اور شامی کی سفارش کے ساتھ شیخ قادر بخش کی دکان پر رکھ آیا تھا۔ اُدھر شامی اب اپنے آپ کو عظیم مگر شفیق قسم کا پینٹر سمجھنے لگا تھا جو اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا اور نوآموزوں کو موقع دینا چاہتا ہو۔ سلمان بالکل فارغ تھا اور جب کبھی شہوار اس کے سٹوڈیو میں جاتی تو اسے کرسی پر بیٹھے، پاؤں کھڑکی کی سل پر رکھے' سگریٹ پھونکتے پاتی یا اسی حالت میں شامی سے باتیں کرتے

دیکھتی۔ رہا شامی تو وہ نواب کسی اور ہوا میں اڑ رہا تھا۔ آگے سے کہیں زیادہ بہتر شخصیت تھی، کہیں زیادہ دولت تھی اور کہیں زیادہ فراغت تھی۔ اب اس نے اشتہاری تصاویر بنانا بھی ترک کر دی تھی بلکہ ایک وسیع کینوس پر ایک علامتی تصویر شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ اپنی فراغت بیشتر سلمان کے سٹوڈیو میں گزارتا اور اسے آرٹ پر لیکچر دیتا رہتا۔ سلمان شامی کا خطبہ کبھی سن لیتا مگر اکثر سر پر سے گزر جانے دیتا۔ شہوار کو بھی کبھی کبھی اپنے سٹوڈیو میں خطباتِ شامی سننے کا اتفاق ہوتا مگر جونہی شامی رخصت ہوتا، بھاگی بھاگی سلمان کے پاس جاتی۔ اس کا سراور وجود غصے سے کانپ رہا ہوتا اور سلمان سے پھر وہی پرانا سوال پوچھتی کہ "تم اس فضول کو اتنی سربراہی کی اجازت کیوں دیتے ہو۔ اگر مجھ سے میری موسیقی کے متعلق کوئی اس پر ستانہ انداز میں بات کرے تو اس کا وہ حشر کروں کہ ساری عمر یاد رکھے" خواہ وہ تان سین ہی کیوں نہ ہو!"

سلمان پوچھنے لگا "تو کیا تم شامی کو اب بھی بڑا آرٹسٹ نہیں مانتیں؟"

"ٹھیک ہے۔" شہوار نے جواب دیا۔ "اس کی تصویریں بک رہی ہیں۔ شاید اچھی ہی ہوں گی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمہارا سربراہ بن جائے جیسے تم ایک نابالغ لونڈے ہو"۔

سلمان ہنس دیا اور کہنے لگا: "تمہاری بات پر مجھے وہ بزبولا یاد آ گیا جسے کسی ستم ظریف نے یہ کہہ کر چپ کر دیا تھا کہ "میاں تمہاری بدتمیزی اگر کسی بادشاہ سے بھی، ایک کالے بھونرے کے خلاف ہی سرزد ہوتی تو جلالت مآب سنگساری کے مستحق ہوتے" بہرحال، شہوار جی، اب بتائیں کیا کیا جائے؟"

شہوار نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا "فقط یہ کہ کاش تم بھی ایک تصویر بیچ سکتے۔"

"بھئی میں نے تو اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔" سلمان بولا۔ "تصویر دکان پر پہنچا دی ہے۔ اب پبلک کا کام ہے کہ پرے باندھے، ناچتے گاتے، میری تصویر کے لئے باہم لڑتے جھگڑتے دکان پر پہنچ جائیں...... اور ہاں ناچنے سے یاد آ گیا تمہاری وہ رقص کی دھن مکمل ہوئی ہے یا نہیں؟"

شہوار کسی جوش کا اظہار کئے بغیر بولی "ہاں، ہوگئی ہے بلکہ کتابی شکل میں چھپ بھی گئی

ہے۔''

''تو پھر منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟'' سلمان بولا'' آنگن میں ناچتے گاتے کیوں نہیں نظر آتے؟''

''اس لئے کہ کتابچہ چھپوانے کی رقم میں نے اپنی جیب سے دی ہے۔'' شہوار نے وجہ بتائی ''تھے تو صرف پانچ سو روپے لیکن کتاب بک نہیں رہی۔ اگر کبھی بک گئی تو شاید دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجائے۔''

''کیا دوسرے ایڈیشن کے لئے بھی تمہیں جیب سے ادا کرنا پڑے گا؟'' سلمان نے سوال کیا۔

''نہیں' دوسرے' تیسرے اور باقی ایڈیشنوں کے لئے ناشر خود ادا کرتا ہے۔''

''ناشر کون ہے؟''

''ناظم علی' کاظم علی برادران۔''

''ارے' اتنے بڑے ناشرین نے تمہاری موسیقی کی کتاب چھاپی ہے تو دوسرا ایڈیشن یقیناً چھپے گا۔ ناظم علی جیسا ماہر شخص تو کم از کم ایک درجن ایڈیشن خود چھاپ سکے گا اور اگر کاظم علی بھی ساتھ جت گیا تو تمہارا گیت بچے بچے کی زبان پر ہوگا۔ معصوم' پنگھوڑوں میں تمہاری دھن گنگنائیں گے۔''

''لیکن ناظم علی نے تو کوئی ایسا یقین نہیں دلایا۔'' شہوار نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''ارے ناظم علی کو تو اپنی صلاحیتوں کا بھی علم نہیں۔ موسیقی کے حلقوں میں اس کی یہی شہرت ہے کہ اسے اپنے آپ پر اعتماد نہیں لیکن اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ صحیح وقت کے انتظار میں رہتا ہے۔ اسے کچھ اور مہلت دو۔'' سلمان نے شہوار کی دلجوئی کے لئے ناظم علی پر لیکچر دے دیا۔

شہوار نے خوشی سے مہلت دے دی اور سچ مچ ناظم علی نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ بے

شک ابتدا میں شہوار کے گیتوں کی مانگ خاصی مختصر تھی مگر اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے۔ شروع میں ہر نئے موسیقار کے گیت کم بکتے ہیں مگر پھر بتدریج شہوار کے گیتوں کی فروخت قطرے سے سیلاب کی شکل اختیار کرنے لگی۔ شہوار دکان پر گئی تو ناظم علی نے پدرانہ خوشی کے ساتھ اسے بتایا کہ اس ایک ہفتے میں دو ایڈیشن بک گئے ہیں۔

اِدھر سلمان بولے'' مجھے تو کبھی شہوار کی کامیابی میں شک ہی نہ تھا۔ اس کے رقص کی دھن کے '' واحد ٹکڑے'' نے ہی مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ میں نے اسی لے میں اپنے پاؤں کی تھپا تھپ سے خراج عقیدت ادا کر دیا تھا۔'' رہا شامی تو کچھ دیر کے لئے وہ بھی خودستائی سے چھٹی لے کر شہوار کو خندہ پیشانی سے مبارک دینے لگا۔

اور پیسے؟ شہوار کی جیب میں قطار اندر قطار بہتے چلے آئے۔ جس سے زندگی کی راہ دیکھتے دیکھتے ہموار ہوگئی۔ کیا پُر لطف دن تھے! شفون کی ساڑھی، ہیرے کی انگوٹھی، سونے کی بالیاں...... قصہ مختصر ایک شاہانہ زندگی تھی۔ ایسی زندگی میں فقط ایک بدمزگی کا احتمال ہوتا ہے کہ کہیں دوسروں کے لئے یہ کامیابی حسد کا باعث نہ بن جائے لیکن شہوار کے معاملہ میں اس بات کا امکان بھی نہ تھا۔ شامی کا برتاؤ اب ایک کامیاب ساتھی کا سا تھا جو ایک قابل مبتدی کو شہرت کی دنیا میں خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ شہوار کے شاگرد تو ہر چند کہ سب کے سب خرد ماغ تھے، اپنی استاد کے پرستار تھے۔ رہا سلمان تو اس کی خوشی کی تو انتہا ہی نہ تھی مگر یہ سلمان ہی تھا جس کی ناکامی نے شہوار کی مسرت کو نامکمل کر رکھا تھا۔ وہ اپنے سے زیادہ اپنے دوست کو کامیاب دیکھنا چاہتی تھی۔ اُدھر سلمان ابھی تک ایک خوش مزاج بلکہ مسخرا نکھٹو ہی تھا اور بدتر یہ کہ شامی کو جھڑکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ شامی دیانت داری سے سلمان کی کچھ رہنمائی کرنا چاہتا تھا۔

نہیں، بلکہ وہ تو سلمان کو محض باجہ تصور کرتا تھا جس پر اپنی شان میں دھنیں بجاتا رہتا تھا اور شامی کی یہی خودستائی شہوار کے لئے سوہانِ روح تھی۔ اب جب کبھی شہوار سلمان کے کمرے کو جاتی اور اندر سے شامی کی باتوں کی آواز آتی تو دروازے پر دستک دیئے بغیر لوٹ آتی۔

ایک شام اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ باہر بلاک کے مشترکہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شہوار نے باہر نکل کر ریسیور اٹھایا اور اُدھر سے کوئی شکایتی لہجے میں بولا

''ہیلو کیا سلمان اُدھر ہے؟''

شہوار نے تھوڑی دیر پہلے سلمان کو زینے سے اترتے ہوئے باہر جاتے دیکھا تھا۔ بولی

''وہ تو باہر نکل گیا ہے۔ کوئی پیغام؟''

''پیغام بالکل ہے۔ میں انور نظامی بول رہا ہوں۔ سلمان مجھے جانتا ہے۔ اسے کہیں کہ یہ جو موسیقی کے کتابچوں کا ٹڈی دَل میرے کمرے میں نازل ہو رہا ہے اس سے کیا سلوک کروں؟ ڈی ڈی ٹی ڈال کر تلف کر دوں یا دریا برد کر دوں یا......''

نظامی کی آواز بتدریج تیز اور ترش ہو رہی تھی۔ بظاہر وہ ذہنی تناؤ کا شکار لگتا تھا اور اسے اس بات کی پروا نہ تھی کہ کس سے بات کر رہا ہے۔ بس اسے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع مل گیا۔ شہوار حیران تو تھی ہی نظامی کو درمیان میں روکا اور پوچھا ''کیا کہا موسیقی کے کتابچے؟''

''جی ہاں! موسیقی کے کتابچے۔ اور ایک دو یا تین نہیں ایک دو یا تین ہزار کتابچے''

پھر مزید غضب ناک ہو کر بولا کہ ''سلمان صاحب میرے ساتھ آخر کیا مذاق فرما رہے ہیں۔'' اور اب وہ شہوار کے ساتھ یوں بے تکلفانہ باتیں کرنے لگا جیسے کسی رازداں سے کی جاتی ہیں۔ مگر شہوار فون بند کرنے کی بجائے باتیں سنتی چلی جا رہی تھی اور نظامی کو تو کوئی سننے والا چاہئے تھا۔ بولنے لگا ''میں مانتا ہوں سلمان نے اپنے گھر کے دو کمرے مجھے عریتاً دے رکھے ہیں کہ میں سکون کے ساتھ یہاں رہ کر اپنا ناول مکمل کر سکوں لیکن ذہن میں ایک خیال آتا ہے اور اوپر سے کتابچوں کا ایک دیو پیکر پارسل نازل ہوتا ہے اور میرے خیال کو پیس کر رکھ دیتا ہے......''

شہوار ٹیلی فون سے چمٹی رہی۔ اس کا دماغ قدرے چکرا رہا تھا لیکن اسے بہت سی باتوں کا عرفان بھی ہو رہا تھا۔

اُدھر سے نظامی نے کلام جاری رکھا ''سن رہی ہو بی بی؟''

''ہاں ہاں' سن رہی ہوں۔ یہ بتاؤ یہ موسیقی کے کتابچے کون بھیج رہا ہے؟''

''کیا کہا میں سمجھا نہیں۔''

''ان کتابچوں کا ناشر کون ہے؟''

''ٹھہریں میں پڑھ کر بتاتا ہوں۔ ہاں' ناظم علی' کاظم علی برادران''

''خوب: میں آپ کا پیغام مسٹر سلمان کو یقیناً پہنچادوں گی۔''

شہوار کو یوں محسوس ہوا کہ ذہن پر ایک بھاری بوجھ آپڑا ہے۔

''ہیلو ہیلو۔ بی بی' سن تو رہی ہو؟''

''جی ہاں' مسٹر نظامی۔''

''سلمان کو یہ بھی بتانا کہ کتابچوں کے علاوہ کچھ پینٹنگ بھی آرہی ہیں؟''

''پینٹنگ؟'' شہوار نے تعجب سے پوچھا۔

''جی ہاں' پینٹنگ۔ کسی شامی نے بنائی ہیں۔ اتنی لمبی اور چوڑی ہیں کہ رکھنے کے لئے جگہ ہی نہیں ہے۔ دیوار کے ساتھ کھڑی کردی ہیں۔''

شہوار نے فون بند کردیا۔ کچھ دیر بعد سلمان سیر سے واپس آیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا تو شہوار آواز سن کر کمرے سے نکلی اور سلمان کو مخاطب کر کے کہنے لگی:

''ایک منٹ کے لئے رک سکیں گے؟''

سلمان حسب معمول ہنس کر بولا۔ یقیناً۔ کوئی تازہ خبر؟ معلوم ہوتا ہے تمہاری موسیقی کے کتابچے کا ایک اور ایڈیشن بک گیا ہے۔''

''نہیں' جناب نواب ذوالفقار علی خان صاحب مدظلہ، ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

شہوار کے لفظ لفظ سے طنز ٹپکتا تھا اور اسے یقین تھا کہ بالائی منزل کے خوش مزاج ہمسائے کا مزاج اور زبان دونوں تتلا جائیں گے۔''

لیکن خیر۔ سلمان نے بھی چوٹ کسی واضح صدمے کے بغیر سہہ لی اور بولا:

''تمہیں میرا نام کس نے بتایا ہے؟''

''نواب زادہ صاحب' میں آپ کے نام کے علاوہ اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔ آپ رنگ پور کے رئیس ہیں ناں؟''

''ہاں ہاں' میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔ باقی رہی نوابزادگی تو اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ میرا باپ نواب تھا۔''

''اور آپ'' شہوار نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ''اپنی دولت سے اپنے دوستوں کے لئے جنت الحمقاء تعمیر کراتے ہیں جسے آسان لفظوں میں بے وقوفوں کی جنت بھی کہتے ہیں اور جب آپ کا دل اس تماشے سے اکتانے لگتا ہے تو اک ادائے بے نیازی سے اس جنت کو بے وقوفوں سمیت منہدم کر دیتے ہیں نواب زادہ صاحب' یہ ذرا ظالمانہ فعل نہیں؟ کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ جب آپ شامی کی تصاویر خریدنا بند کر دیں گے تو اس غریب پر کیا بیتے گی؟''

''بی بی'' سلمان نے پورے سکون سے کہا۔ ''میں شامی کی تصویریں خریدنا کبھی بند نہیں کروں گا۔ رنگ پور کا نواب زادہ یہ کچھ بھی نہ کر سکا تو پھر اس کی نوابی کس کام کی؟ سو' شامی تصویریں بناتا رہے گا میں خریدتا رہوں گا اور شامی کو اس بات کی خبر بھی نہ ہوگی۔ شامی کی دنیا حسب معمول آباد رہے گی۔''

''ماشاءاللہ'' شہوار نے طنزاً کہا۔ ''اور حضور نے فدویہ کے لئے کیا مستقبل تجویز فرمایا ہے۔''

''تمہارا مستقبل؟'' سلمان ایک لمحے کے لئے سوچ کے انداز میں رکا اور پھر ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا'' میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔''

شہوار سر سے پاؤں تک تن گئی۔ ہر چند کہ سلمان نے اس کی چیرتی ہوئی نگاہوں کا نیاز مندانہ استقبال کیا۔ شہوار نے مزید تنتے ہوئے پوچھا: ''مجھ سے کیا کرو گے؟''

''شادی' شادی!'' سلمان نے فوراً جواب دیا'' مجھے معلوم ہے تمہیں یہ فکر ستا رہا ہوگا کہ

شاید میں تمہیں اسی مکان میں رہنے کو لے جاؤں گا جو شامی کے ''شاہکاروں'' سے مزین ہوگا' تو ایسا نہیں ہوگا۔ شامی کی تصویریں کسی اندھیری بکھاری میں پھینک دیں گے۔''

شہوار نے کچھ بولنا چاہا مگر سلمان نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: ''ذرا بیٹھ جاؤ میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کے پہلے 28 سال اور تین مہینوں کو تو جانے دو سوائے اس کے کہ میں اکثر اوقات ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں رہتا جو بالکل تم جیسی ہو۔ پھر ایک مہینہ اور نو دن ہوئے میں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔ ہوا یوں کہ تم کسی تقریب پر اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں گئی تھی۔ اتفاق سے میں بھی شریکِ محفل تھا۔ تمہیں جی بھر کر دیکھا مگر ذرا فاصلے سے تقریب ختم ہوئی تو تم نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور چل نکلیں میں نے............

''نواب صاحب'' شہوار بولی۔'' مجھے آپ کی کہانی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔''

''خاموش' خاموش'' سلمان نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' کہانی یہیں سے تو ایک نازک موڑ پر آنا چاہتی ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا ہاں! تم ٹیکسی میں چل نکلیں۔ میں نے بھی ٹیکسی لی اور تمہارے تعاقب میں چل پڑا۔ تمہاری ٹیکسی زیرو پوائنٹ سے ہوتی ہوئی سیکٹر 9 کے موڑ سے گزر کر پشاور روڈ پر جا پہنچی اور بائیں ہاتھ پنڈی کا رخ کیا۔ میں چند گز کے فاصلے پر پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور کچھ حیران تھا کہ یہ قافلہ تو بہار کہیں ٹھہرے گا بھی یا نہیں۔ خوش قسمتی سے جلد ہی تمہاری ٹیکسی ویسٹ رج کو مڑی اور ایک فلیٹ کے پاس رکی اور تم ٹیکسی سے نکل کر اسی کمرے میں داخل ہوگئیں جس کے دروازے پر ہم کھڑے ہیں۔ جب تم اپنے دروازے کے پیچھے غائب ہوگئیں تو میں بھی ٹیکسی سے نکلا حسنِ اتفاق سے تم سے اوپر والے کمرے کی پیشانی پر ایک نوٹس نظر آیا جس پر لکھا تھا'' سٹوڈیو کرائے کے لئے خالی ہے۔'' میں نے سوچا کہ تھوڑی سی شوقیہ مصوری تو کر ہی چکا ہوں۔ کیوں نہ مصور کے بھیس میں تمہارے قریب رہنا شروع کر دوں۔ سو میں نے سٹوڈیو کرائے پر لے لیا اور ساتھ ہی ایک فرضی نام بھی مفت رکھ لیا۔ سلمان علی۔ اب جائے پناہ تو مل گئی تھی مگر سوال یہ تھا کہ تم تک رسائی کیسے ہو۔ ایک دن سوچ ہی رہا تھا کہ تمہارے کمرے سے پیانو

کی آواز آئی میں نے کہا وہ مارا۔ ادھر تم نے سُر نکالی' ادھر میں نے تمہاری سُر کے تال پر فرش کو پاؤں سے پیٹنا شروع کیا تا آنکہ افلاک سے نالوں کا جواب آ گیا...... پسند آئی میری کہانی؟

''تو کیا تم نے صرف اس لئے فرش پیٹنا شروع کیا کہ مجھے اوپر آنا پڑے؟''

''جی ہاں' بالکل!'' سلمان نے اقرار کیا ''شاید بری بات تھی لیکن ہو گئی۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں تمہاری موسیقی کے کتابچے خرید تا رہا ہوں۔ تم نے مجھے دوستوں کے لئے جنت الحمقا تعمیر کرنے کا طعنہ دیا ہے مگر نام صرف ایک دوست شامی کا لیا ہے۔ ظاہر ہے دوسرے دوست تم خود ہی ہو۔ جب میں نے تمہارے ناشر ناظم علی کاظم علی سے تمہارے کتابچے خریدنے کا معاہدہ کیا تھا تو دونوں بھائیوں نے خدا کے نام پر قسم کھائی تھی کہ یہ راز کسی پر افشا نہ کریں گے۔ میں حیران ہوں کہ تم پر یہ راز کیسے کھلا۔''

شہوار بولی ''تھوڑی دیر ہوئی کسی نظامی نے فون کیا اور کہا کہ مسٹر سلمان کو بتا دینا کہ ان موسیقی کے کتابچوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کمرے میں کتابچوں کے ڈھیر لگ گئے ہیں اور لمبی چوڑی پینٹنگ ان کے علاوہ ہیں۔''

''اچھا تو یہ نظامی تھا۔ بے چارہ نظامی'' سلمان یہ کہتے ہوئے قہقہہ نہ روک سکا۔ ''میں تو غریب کو بھول ہی چکا تھا۔ میں نے اسے اپنے اسلام آباد والے مکان میں عارضی طور پر دو کمرے دیئے تھے کہ وہ ذرا سکون سے اپنا ناول مکمل کر لے۔ ظاہر ہے کہ غریب کا سکون......''

''نواب صاحب'' شہوار نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''چلیں میں مان لیتی ہوں کہ آپ کی نیت میرا دل دکھانے کی نہ تھی بلکہ خاص شفقت سے پیش آنا چاہتے تھے مگر یہ خیال نہ آیا کہ مجھے میری اپنی نظروں میں کتنا ذلیل کر دیا۔ آپ نے مجھ سے بالکل بچوں کا سا سلوک کیا ہے اور محض بہلانے کی خاطر مجھے جھوٹی کامیابی کا احساس دلایا ہے۔ کیا شریفوں کا......''

شہوار اپنا جملہ ختم نہ کر پائی تھی کہ سلمان نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شہوار سے کہنے لگا:

''قطعِ کلام معاف' اجازت ہو تو ایک خط پڑھ کر سناؤں۔''

''ایک خط؟'' شہوار نے پوچھا

''جی ہاں' بالکل مختصر سا۔ یہ خط مجھے شیخ قادر بخش تصویر فروش نے بھیجا ہے۔ لکھتا ہے:

''جنابِ عالی۔ میں آپ کو بتاتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ آج آپ کی تصویر'' بچہ اور بلی'' کے لئے پانچ ہزار روپے کی پیشکش موصول ہوئی ہے۔ براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا اس قیمت پر آپ کی پینٹنگ بیچ دوں؟ آپ کا شیخ قادر بخش''

''پھر؟'' شہوار نے آہستہ سے کہا۔

''پھر یہ کہ میں ابھی ابھی شیخ قادر بخش سے مل کر آ رہا ہوں'' کہنے لگا: ''خریدار کا نام بیگم مراد ہے۔'' بلکہ اس نے مجھے بیگم مراد کا پتہ بھی دیا میں خاتون کے گھر چلا گیا لیکن وہاں بیگم مراد نام کی کوئی عورت نہ تھی۔ ہاں' تمہاری ایک شاگرد موجود تھی جو وہیں رہتی بھی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ کے یہاں بیگم مراد کے نام پارسل وغیرہ آنے والا ہے؟ تو بولی'' جی ہاں' مس شہوار کا خط آیا جس میں اس نام پر پارسل کے آنے کا ذکر ہے اور مجھے موصول کرنے کی ہدایت دی ہے۔ میں پارسل کا انتظار کر رہی ہوں۔''

شہوار نے کھسیانی ہنسی چھپانے کے لئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سلمان سے کہا:

''جاؤ بھاگو یہاں سے۔''

سلمان ایک قدم اور قریب آ گیا اور بولا'' تمہیں وہ کہانی تو یاد ہوگی جس میں ایک دور افتادہ جزیرے کے غریب باشندے ایک دوسرے کے کپڑے دھو کر گزارہ کرتے تھے۔''

''جاؤ بھی نا'' شہوار نے منہ چھپاتے ہوئے دہرایا

''میرا یقین ہے'' سلمان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا'' وہ لوگ اسی باعث ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہوں گے۔ بہت ہی قریب!''

''میں نے کہانا' جاؤ'' شہوار نے بظاہر جھنجھلا کر کہا۔

''میں نہیں جاؤں گا'' سلمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اور اس وقت تک یہیں کھڑا رہوں گا جب تک تم اپنی زبان سے نہیں کہتیں کہ میں تم سے شادی کروں گی۔''

''سلمان خدا کے لئے ابھی جاؤ'' شہوار نے التجا کی

''بالکل نہیں'' سلمان اڑ گیا

''بھئی مانو ناں۔ ذرا جاؤ اور مجھے سوچنے دو۔''

سلمان بادلِ نخواستہ دروازے سے باہر نکلا ایک لمحے کے لئے رکا مگر پھر شہوار کے کمرے کا دروازہ بند کر کے بھاری قدموں سے اپنے سٹوڈیو کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ شہوار کو سلمان کے کمرے سے ویسے ہی بھاری قدموں سے دیوار تا دیوار چلنے کی آواز آئی جیسے ایک جانور پنجرے میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چل کر وقت گزارتا ہے۔ ظاہر تھا کہ سلمان بھی شہوار کے فیصلے کے انتظار میں بے چینی کے لمحے گزار رہا تھا...... پھر اچانک شہوار اٹھ کھڑی ہوئی ایک پھریری لی۔ کمرے کے کونے سے لمبی چھڑی اٹھائی اور چھت کو چھڑی سے لگا تار تین میٹھی میٹھی ضربیں لگائیں۔

# ہے یہ وہ آتش غالب

ناہید کو سوتے ہوئے اپنے پاؤں کی انگلیاں ٹھنڈی بھی لگیں اور گیلی بھی۔ نتیجتاً اس نے اپنے جسم کو ایک ناروا سے زاویے پر دوہرا کرنے کی کوشش کی حتیٰ کہ اس کے گھٹنے ناک سے جا ٹکرائے۔ وہ پوری طرح جاگی نہ تھی مگر اسے اپنا گرد و پیش اس راحت کدے سے بہت مختلف محسوس ہوا جس میں وہ قیام پذیر تھی۔ وہ ایک بحری جہاز میں تفریحی سفر پر تھی اور پچھلی رات' معمول کی رنگ رلیوں کے بعد اپنے نرم و ملائم بستر پر سوئی تھی مگر اب تکیہ تھا کہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ جسم پر کوئی کمبل بھی نہ تھا اور چہرے پر تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ کیا وہ آج پھر معمول سے زیادہ سوتی رہی تھی کہ سورج نے کیبن Cabin کی کھڑکی سے اس کے رخ تاباں پر پھر نگاہیں مرکوز کر لی تھیں؟ ادھر کوئی شے اس کی پسلیوں میں مسلسل چبھ رہی تھی۔ شاید کتاب ہو جو وہ ہر رات بستر میں پڑھتے پڑھتے سو جاتی تھی اور اگلی صبح جسم کے کسی دور افتادہ حصے سے پیوستہ ملتی تھی۔ اسے اس بے کلی میں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ اٹھ بیٹھے یا...... ہر کاہل شخص کی طرح...... پانچ منٹ اور سو لے! لیکن اتنے میں سمندر کی ایک لہر نے اسے کندھوں تک نہلا دیا۔ وہ یک لخت اٹھ بیٹھی اور دیکھا تو بستر ندارد۔ مزید دیکھا تو پورا جہاز غائب ہے اور بسیط سمندر کے ایک چھوٹے سے جزیرے کے کنارے بیٹھی ہے جہاں اسے سمندر کی کوئی مہربان موج بہا کر لے آئی تھی۔ اور

---

Natural Causes By Ian Hay

ریت اور سنگریزوں کے بستر پر بے ہوش چھوڑ گئی تھی۔ اب چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے ننگے پاؤں اور نیم عریاں گھٹنوں کو چھو کر سمندر میں آ جا رہی تھیں اور ہاں وہ پہلو میں چبھنے والی نوک کتاب کی نہ تھی۔ ایک چٹان کی تھی۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ حدِ نگاہ تک کوئی آدم زاد نظر نہ آیا۔ لیکن عورت تھی اسے سب سے پہلا خیال اپنی شکل وصورت اور لباس کا آیا۔ اس کا میک اپ تو سمندر کی موجوں نے چاٹ لیا تھا۔ اس کے کمر تک لمبے کالے بال جو کبھی ریشم کے جھولتے گچھے نظر آتے تھے، اب ریت سے لت پت تھے۔ اس نے لباس کا جائزہ لیا تو اس کے منہ سے بے اختیار ''اف میرے اللہ'' نکلی۔ اس کے شبینہ لبادے میں گریبان کے علاوہ جیبیوں اور چاک تھے۔ بندِ قبا سب ٹوٹ چکے تھے۔ ہاں اس کے لبادے کے اردگرد ایک حفاظتی پیٹی بندھی تھی لیکن وہ حیران تھی، یہ کہاں سے آئی اور کس نے باندھی۔

اور پھر اچانک اسے سب کچھ یاد آنے لگا: وہ رنگ رنگیلا بجرا Yacht وہ سیر سرور کا عشرت کدہ جو بحرالکاہل کی پُرسکون سطح پر رواں تھا۔ پھر وہ پچھلی شب سو جانے کے بعد ناگہانی طوفان اور رات کے سناٹے میں کسی سمندری چٹان سے جہاز کی ٹکر' وہ مردمسافروں کا شور۔ وہ خواتین کی چیخیں' وہ دومہربان ہاتھوں اور ایک حفاظتی پیٹی کا ہالہ جنہیں تاریکی میں اس نے اچانک اپنی کمر کے گرد محسوس کیا' اور پھر وہ پانی کا خوفناک ریلا جو اسے اور اس کے ساتھیوں کو تنکے کی طرح سمندر میں بہالے گیا...... اور اب

کوئی چھ سات گھنٹے بعد' وہ اس چھوٹے سے جزیرے کے کنارے زندہ مگر تنہا بیٹھی تھی۔ ظاہر ہے یہ معجزہ تھا اور معجزہ بھی' قسمت کے علاوہ اس حفاظتی پیٹی کا۔ اس نے پیٹی کھولی، اسے چوما۔ کیا یہ وہی پیٹی تھی جو اس کے کیبن مین بے مقصد لٹکی رہتی تھی؟ پیٹی پر جہاز کا نام اور کمرے کا نمبر لکھا تھا۔ اس نے پڑھا ''ملکہ جزائر' شاہی کیبن نمبر 3 '' نہیں' یہ وہ پیٹی نہ تھی۔ اس کے کمرے اور پیٹی کا نمبر تو 7 تھا۔ تو کیا نمبر 3 کے مکین نے اپنی پیٹی دے کر اس کی جان بچائی تھی؟ شاید!

اب ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو ذہن میں سوالوں نے سر اٹھایا'' میں کہاں ہوں؟ میرے

ساتھی کیا ہوئے؟ کہیں وہ سب کے سب غرق تو نہیں ہو گئے! اف میرے اللہ کتنے پیارے لوگ تھے وہ۔ وہ ہمارے مہربان میزبان اور جہاز کے مالک سردار عثمان علی! ہائے وہ تو بحرالکاہل کو گھر کا تالاب سمجھتے تھے۔ وہ رانا آفتاب عالم اور ان کی خوش مزاج بیگم وہ مسز عابدہ رحیم اور انکے بچے وہ مس روحی اور اس کا خوش طبع منگیتر اور...... "پھر دفعتاً ناہید کو ایک نام یاد آیا اور اس کے تیور بگڑنے لگے...... اور وہ کامران! وہ برخود غلط انسان خو بر ودگر پر لے درجے کا بد تمیز۔ کہا کرتا تھا: ہر لڑکی مجھ سے محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے: اوچھا کہیں کا...... "مگر کچھ سوچ کر ناہید کے تیور بحال ہونے لگے" مگر اب کہاں ہے کامران؟ اب تو بے چارہ دوسروں کے ساتھ سینکڑوں فٹ گہری بحری قبر میں پڑا ہوگا۔ موت کے بعد نفرتیں کیسی؟ تین ہفتوں کے بحری سفر کی اس کی تمام تر عشق بازیاں اور زبان درازیاں اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ ہمیشہ کے لئے!......

آخر وجہ کیا تھی کہ کامران سے اسے اس قدر نفرت ہو گئی تھی؟ کیا اس لئے کہ اس نے ناہید سے شادی کی درخواست کی تھی؟ شادی کی درخواست تو کوئی گناہ نہیں ورنہ ناہید درجنوں دوسرے مشتاقانِ شادی کے لئے بھی ایسے ہی زہر بھرے جذبات رکھتی۔ ان سب کے ساتھ تو جہاز میں یوں ہنستی کھیلتی رہی تھی، جیسے انہوں نے کھانے کی میز پر فقط نمک یا چٹنی مانگی ہو۔ کیا یہ وجہ تھی کہ کامران نے شادی کی درخواست تعارف کے تیسرے روز ہی کر دی تھی؟ نہیں، یہ وجہ بھی نہیں ہوسکتی۔ اس کے ایک پھرتیلے شیدائی کا تو تعارف کے بعد پہلا کلمہ ہی پیامِ شادی پر مشتمل تھا۔ مگر ناہید نے اسے ہنسی میں ٹال دیا تھا بلکہ دل میں جشنِ فتح بھی منایا تھا۔ کامران کے معاملے میں خرابی دراصل یہ ہوگئی کہ آدمی خودسر سا تھا۔ ناہید کو پیغام پہنچایا تو کچھ اس انداز سے جیسے احسان کر رہا ہوں۔ ادھر ناہید کو اپنے پرستاروں سے یہ توقع تھی کہ کوئی شادی کی درخواست کرنا چاہے تو یوں کرے جیسے پرستش کر رہا ہو...... چنانچہ جب ایک شام ناہید نے کامران کا شادی کا پیغام ٹھکرا دیا تو بجائے اس کے کہ اپنا فیل شدہ کنوارہ منہ لے کر جہاز کے کسی تاریک کونے میں گم ہو جاتا، اکڑ کر کہنے لگا "مس ناہید، تمہاری حالت پر رحم آتا ہے۔ تم شاید ذہین تو ہو اور تم میں کچھ انا بھی

ہے مگر مجموعی طور پر تم ایک بگڑی ہوئی لڑکی ہو۔ اپنے سے کم تر لوگوں سے محبت کرنا تمہارے لئے ممکن نہیں اور اپنے سے بہتر مردوں کا قرب تمہارے نصیب میں نہیں کیونکہ تمہارا بے جا غرور تمہیں کسی کارِ خیر کی اجازت نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ کہ تم نہ ادھر کی رہی ہو، نہ ادھر کی۔''

ناہید نے غصے میں جیسے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ بولی'' تو کیا تم اپنے آپ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو؟''

''بالکل۔'' کامران نے جواب دیا۔

کامران نے اپنی اکڑ فوں تو ایک لفظ میں لپیٹ کر پیش کر دی تھی مگر پھنس گیا۔ ناہید مجسم کینہ بن کر بولی'' تو پھر مجھے مطیع کیوں نہیں کر لیتے؟''

اب اس بات کا دراصل کوئی جواب تو نہیں تھا مگر خود پسند کامران بے جھجک بولا' میں نے تمہیں مطیع کرنے کا ارادہ کر لیا تو تم بھاگ نکلو گی''

''میں کیوں بھاگوں گی؟'' ناہید نے حقارت سے پوچھا'' مجھے کس کا ڈر؟''

''میرا ڈر'' کامران نے چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کبھی آئینے میں حلیہ شریف دیکھا ہے؟'' ناہید نے استفسار کیا۔

''ہر روز دیکھتا ہوں بالکل اے ون ہے'' کامران نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

''تو پھر چلاؤ جو تیر چلانا ہے اور کرو مطیع'' ناہید نے للکارا۔

''تیر تو ضرور چلاتا'' کامران بولا'' مگر جہاز پر اتنے مہذب لوگوں کی موجودگی میں مناسب نہیں۔ ہاں اگر ہم اور تم کسی غیر آباد جزیرے میں ہوتے یا غاروں کی زندگی کا زمانہ ہوتا تو پھر......''

''تو گویا تم مجھے زمانہ قبل تاریخ کی کلہاڑی سے مطیع کرتے؟'' ناہید نے ازرہِ تمسخر پوچھا۔

''نہیں' نہیں' اس کی ضرورت ہی نہ پڑتی'' کامران نے جواب دیا۔'' کلہاڑی سے تو میں ان رقیبوں کا صفایا کرتا جو تمہاری نوازشات کے امیدوار ہوتے۔ اس کے بعد رہی تم! تو وہ کیا کہتے ہیں: کچے دھاگے سے کھچی آئے گی سرکار مری۔''

''اور یہ بھی تو ممکن ہے'' ناہید نے جواب آں غزل کے طور پر کہا

صاف انکار کرے آنے سے سرکاری تیری

''ناممکن'' کامران وثوق سے بولا ''ناممکن۔ کیونکہ تم یہ سوچو گی کہ مجھے بہترین مرد نے بزور بازو جیتا ہے اور ایسا ہی مرد ہر عورت کے دل میں بستا ہے۔''

''دیکھو مسٹر'' ناہید نے سمجھاتے ہوئے کہا: ''اگر تم واقعی ان باتوں پر یقین رکھتے ہو تو پھر تمہاری کھوپڑی میں وہ بھُس بھی نہیں جس کا مجھے شبہ تھا۔ مکمل خلا ہے۔ اگر تمہارے فلسفے میں جان ہوتی تو نوے فیصد عورتیں سلطان راہی کے حرم میں ہوتیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ماڈرن عورت خوش مذاق بھی ہے اور خود مختار بھی۔''

اس پر کامران اٹھ کھڑا ہوا اور بولا میں ایک آخری بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہم کافی دیر سے دوسروں سے الگ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ لوگ حیران ہوں گے ہم کیا سازش کر رہے ہیں، لہٰذا ہمیں جانا چاہئے لیکن جانے سے پہلے تم نے جو کچھ کہنا ہے کہہ دو: ہاں یا نہ؟''

اس پر ناہید بھی اٹھی مگر کوئی جواب دیئے بغیر ایک تمکنت کے ساتھ خاموش ایک طرف نکل گئی۔ یہ دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ اگر جہاز کی بجائے یہ واقعہ کسی شہر میں ہوا ہوتا تو ناہید کا کامران سے دوبارہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا مگر سمندری جہاز کی محدود دنیا میں دو مسافروں کی مڈبھیڑ ناگزیر ہے۔ ناہید نے کچھ عرصہ تو کامران سے ٹکرانے سے ارادتاً پرہیز کیا مگر ایک دن جب کامران نے خاموش گزرتی ہوئی ناہید کو ''بھاگ جانے'' کا پرانا طعنہ دیا تو ناہید نے انداز سلوک بدلا۔ لوگوں کے سامنے تو ایک خانہ ساز ہنسی سے علیک سلیک کر لیتی مگر اکیلے میں آمنا سامنا ہو جاتا تو کامران کے چہرے پر تکنے کی بجائے اپنے جوتوں کا معائنہ کرتے گزر جاتی۔ کامران نے ناہید کے ظاہر لطف و کرم اور باطنی قہر و غضب کا ایک ہفتہ تو ہنس یار و کر گزارا مگر پھر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک شب کہ چاند کی چودھویں تھی اور اس رومان انگیز فضا میں اسے ضبط محبت کا یارانہ تھا' سیدھا ناہید کے حضور پہنچا اور بقول داغ:

میں نے اس کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا ' دل رکھ دیا ' سر رکھ دیا!

ناہید نے جب دیکھا کہ کامران نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور غیر مشروط اطاعت پر آمادہ ہے تو پہلے تو اس کی داستانِ غم سنی اور سن چکی تو شریفانہ انکار کے بعد صبر و شکر کی تلقین کی۔ اس پر کامران کی مردانہ غیرت کا پارا بلند ہونے لگا تو ناہید نے زنانہ لعنت وملامت کا ایک فصیح دریا بہا دیا۔ کامران صاحب تنگ مزاج ہونے کے علاوہ تھوڑے سے بے وقوف بھی تھے۔ گرمی کھا گئے اور ناہید کو، جسے ایک لمحہ پہلے جان و دل پیش کر رہے تھے...... وہ ناروا باتیں کہہ دیں جو ایک خاتون سے نہیں کہی جاتیں۔

دوسرا ہفتہ آرام سے گزرا لیکن آخری روز ناہید ڈنر سے فارغ ہو کر اپنے کیبن کو جا رہی تھی کہ دیکھا: کامران راستہ روکے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ سفید تھا اور دانت دندنا رہے تھے' سردی یا خوف سے نہیں: ہیجان سے۔

''مجھے گزرنے دو'' ناہید نے مختصراً مگر قدرے پریشانی سے کہا

کامران نے جواب دیا'' میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا تھا۔ میں نے آج تک جتنی لڑکیاں دیکھی ہیں' ان تمام میں سے تم نہایت کمینہ اور قابلِ نفرت لڑکی ہو۔ سنا؟ اب تم جا سکتی ہو۔''

یہ پچھلی رات کی بات تھی یعنی اب سے چند گھنٹے پہلے کی مگر اس وقت کامران مر چکا تھا اور اس کی لاش سمندر کی تہہ میں پڑی تھی۔ ناہید نے چاروں طرف دیکھا خصوصاً اپنے پیچھے جزیرے کے مرکز کو جہاں ناریل کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ سامنے سمندر تھا اور اس کی ابھرتی اور اترتی لہریں، کیا وہ بالکل تنہا تھی؟ ناہید ایک دل جگرے والی لڑکی تھی اور جب تک کوئی ٹھوس وجہ نہ ہو' اس کا خوف کھانے کا ارادہ یا امکان نہ تھا۔

وہ یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی اور جزیرے کے اندر چل نکلی۔ سامنے چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ جس کی چوٹی سے وہ اپنی مملکت کا جائزہ لے سکتی تھی اور قسمت نے ساتھ دیا تو کسی گزرتے جہاز کو

اشارہ بھی کر سکتی تھی۔ وہ ناامید نہیں تھی اس کی نبض ذرا تیز تھی اور چلتے چلتے اس کے خوبصورت ننگے پاؤں ریت میں ذرا دھنس جاتے تھے مگر وہ کوئی مشکل محسوس نہیں کر رہی تھی۔

لیکن اسی اثنا میں ایک قریب ہی کی پہاڑی کی اوٹ میں بیٹھا کامران اپنی ''محبوبہ'' کی حرکات بے چینی سے دیکھ رہا تھا بلکہ زیرِ لب ہنس بھی رہا تھا۔ دراصل اس کی سب سے بڑی خوبی...... یا بعض لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی خرابی...... اس کی بے وقت حس ظرافت تھی وہ بھی ناہید کی طرح' ابھی ابھی موت کے منہ سے بچا تھا لیکن پھر بھی حالات سے لطف کشید کر رہا تھا۔ اس کا پاجامہ تیزی سے خشک ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اپنے آپ کو آنکھ مارتے ہوئے' ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے زیرِ لب بولا: ''اب بس ایک کلہاڑی کا انتظام کرنا پڑے گا'' اور ہنس دیا۔

ادھر ناہید' جزیرے کا معائنہ کرنے کے بعد' تنہائی سے پریشان پیٹ کے بل ریت پر لیٹ گئی۔ جزیرے کا رقبہ یہی کوئی ایک مربع میل کے برابر تھا۔ لیکن جتنا بھی تھا اس کی واحد ملکہ تھی۔ جزیرے میں آبادی کے کوئی آثار نہ تھے، چنانچہ وہ بالکل سکون سے لیٹی ہوئی تھی۔ بس ایک آدھ دفعہ اس کے کندھوں میں کپکپی سی محسوس ہوئی۔

پھر اچانک' جیسے آسمان سے موسیقی کا ورود ہوا ہو' اس کے کانوں میں انسانی کھانسی کی آواز آئی اور ایک لمحے میں خوف کا وہ جالا جو اس کے حواس پر چھا رہا تھا' غائب ہو گیا۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس دور افتادہ ویرانے میں کوئی اور انسان بھی موجود ہے۔ بہر حال کھانسی کی آواز سنتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر کی ایک جنبش سے اپنی لمبی زلفوں کو آنکھوں سے اٹھا کر پشت پر دے پھینکا اور دیکھتی کیا ہے کہ اس کے سامنے کامران کھڑا ہے۔

''اچھا' تم؟'' ناہید نے کسی قدر ہانپتے ہوئے کہا

''جی ہاں میں' یعنی خاکسار کامران اور فقط کامران''

''تو کیا باقی تمام ساتھی......؟'' ناہید نے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے معلوم نہیں'' کامران نے جواب دیا ''میرا خیال ہے بہت سے لوگ کشتیوں میں بیٹھ

کر بچ نکلے ہوں گے مگر کچھ لوگ اس بڑی لہر کی لپیٹ میں آ گئے جس میں تم بھی تھیں اور میں بھی۔"

"مگر ہم بچ گئے تو کیا دوسرے بھی کہیں اسی جزیرے پر نہیں ہوں گے؟" ناہید نے پوچھا

"میرا خیال تو نہیں کہ وہ بچ سکے ہوں" کامران بولا "بہر حال وہ اس جزیرے پر نہیں میں نے اس کا چپہ چپہ دیکھ لیا ہے۔"

"اس جزیرے پر درختوں کے علاوہ کوئی انسانی زندگی کے آثار بھی ہیں یا نہیں؟" ناہید نے سوال کیا۔

"آثار تو ہیں مگر انسان نہیں" کامران بولا "بس کہیں کوئی لکڑی کی بنی ہوئی شے ہے' کہیں دھات کی اور سب ٹوٹی پھوٹی۔ مگر میں نے اس خیال سے یہ سب چیزیں اکٹھی کر لی ہیں کہ گھریلو استعمال میں مفید رہیں گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا گھریلو استعمال سے؟" ناہید نے مطالبہ کیا۔

"بھئی مطلب وہی ہے جو میں نے کہا ہے" کامران نے تشریح کرتے ہوئے کہا" بالکل ممکن ہے ہمیں یہاں مہینوں رہنا پڑے' اور ہاں' تمہیں کچھ خانہ داری سے بھی جان پہچان ہے یا نہیں؟ میرا مطلب ہے کیا چولہا وغیرہ سنبھال سکو گی نا؟ گھر سے باہر کے کاموں کے لئے تو میں دوڑ بھاگ کرتا رہوں گا"

ناہید کے منہ سے بے اختیار چیخ سی نکل گئی" میں اکیلی تمہارے ساتھ مہینوں ...... بالکل نہیں رہ سکتی"

"محترمہ یہ رہ سکنے کی بات نہیں۔ تمہیں رہنا پڑے گا تا آنکہ کوئی جہاز ادھر آ نکلے اور ہمیں ساتھ لے جائے مگر اس لمحے تک تمہیں خاتونِ غار Cave woman کی زندگی بسر کرنا پڑے گی" کامران نے تفصیل سے سمجھایا۔

ناہید کو معاً کامران کی وہ غار اور کلہاڑی والی باتیں یاد آنے لگیں جو چند روز قبل ان کے درمیان جہاز پر ہوئی تھیں، چنانچہ کامران کے جواب میں ایک طنزیہ لہجے میں بولی:" پہلے ذرا اپنا

''کر چکا ہوں' مس ناہید'' کامران نے خوشی خوشی جواب دیا'' خوش قسمتی سے بڑا نفیس غار ملا ہے اور بالکل قریب ہی عین اس پہاڑی کے نیچے۔ دیکھنا چاہو گی؟ آؤ پلیز''

کامران آگے آگے چل پڑا اور ناہید پیچھے پیچھے اگرچہ ناہید کی تھکی تھکی چال سے عدم تعاون کے آثار نمایاں تھے۔ اسے یہ خوف ستا رہا تھا کہ وہ تاریخ کے اس زمانے میں داخل ہو رہی ہے جہاں مرد آقا ہوتا ہے اور عورت غلام' حکم کی بندی وہ سوچنے لگی' ابھی یہ حکم دینے لگے گا: ادھر آؤ' بیٹھ جاؤ' کھڑی رہو۔

اوئے اللہ' میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کروں گی۔ ذرا اسے حکم تو چلانے دو۔''

غار بالکل قریب تھا اور خاصا فراخ کوئی پندرہ فٹ لمبا تھا۔ اس کا دروازہ جنوب کو سمندر کی طرف کھلتا تھا اور سورج کی شعائیں دن بھر اس کے ریتلے فرش کو گرم' خشک اور روشن رکھتی تھیں۔

''کم از کم سونے کی جگہ تو مل گئی ہے نا'' کامران نے ایک عیش کے عالم میں ناہید سے کہا ''لیکن یہ وقت سونے کا نہیں' کچھ کھانے کا ہے آؤ کچھ خوراک تلاش کریں''۔

سو' ایک بار پھر دو افراد کا جلوس روانہ ہوا۔ مرد حسب معمول آگے اور عورت اس کے پیچھے۔ قریب ہی انہیں پھل سے لدا ہوا ایک ناریل کا درخت مل گیا۔ پھل خاصی بلندی پہ تھا۔ مگر کامران کے مضبوط دست و پا کی رسائی سے باہر نہیں تھا۔ جلد ہی اس نے ناریل کا اس قدر گودا اور پانی حاصل کر لیا کہ دونوں نے سیر ہو کر کھا پی لیا اور ہر دو کے منہ سے خود بخود الحمد اللہ نکلی۔

کھانا ختم ہوا تو کامران بولا'' یہ پہاڑی جس کے دامن میں ہمارا غار ہے، جزیرے کی سب سے اونچی پہاڑی ہے۔ ذرا دیکھو اس کی چوٹی۔ چلیں' اسے نانگا پربت کا نام دیتے ہیں''

ناہید سنتی رہی اور چپ رہی۔

''کبھی نانگا پربت پر چڑھی ہو؟'' کامران نے استفسار کیا۔

''نہیں''

''تو آؤ اب چڑھتے ہیں۔ چوٹی سے ہمیں وہ چیزیں نظر آئیں گی جو اس پستی سے ابھی تک اوجھل ہیں۔ بہر حال یہاں بیٹھے بیٹھے انگڑائیاں لینے سے فائدہ؟''

تعمیل حکم سے زیادہ پہاڑی کی چوٹی دیکھنے کی خاطر ناہید خاصی پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ جی ہاں' کامران پھر آگے اور ناہید اس کے پیچھے۔ چڑھائی کے مشکل مقامات پر کامران نے ناہید کی حسب ضرورت اور کبھی بلاضرورت مدد کرنا چاہی لیکن ہر دفعہ ناہید کو احسانِ غیر سے بے نیاز پایا۔ آخر دونوں تقریباً بیک وقت چوٹی پر پہنچے۔

کامران بولا: اب ہم چاروں طرف افق تک سمندر کا معائنہ کریں گے۔ کچھ نظر آئے تو بتانا۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ سوائے ان سامنے والی چٹانوں کے جو سمندر سے اس طرح ابھری ہوئی نظر آتی ہیں جیسے درختوں کی قطار ہو۔''

''مجھے تو اس تشبیہ میں کوئی خاص کاریگری نظر نہیں آتی'' ناہید نے چوٹ کی۔

''چلو نہ سہی۔ اپنا اپنا حسنِ مذاق ہے'' کامران نے جواب دیا اور معاً چلایا ''ارے ذرا غور سے دیکھو۔ مجھے کچھ اور بھی نظر آرہا ہے''...... اور جوش کے لمحے میں ناہید کا بازو پکڑ کر اس رخ لمبا کرنے لگا۔

ناہید نے کسی قدر سرد مہری سے اسے یاد دلایا ''تم نے میرا بازو پکڑ رکھا ہے۔ چھوڑو اسے'' کامران پہلے ہی بازو چھوڑ چکا تھا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دوربین بنا کر دور سمندر میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اچانک بے صبری سے کہنے لگا: ''ناہید دیکھو! تمہیں ان دو درختوں کے درمیان کوئی چیز نظر آتی ہے؟ مجھے تو یہ کسی ڈوبے ہوئے جہاز کا حصہ لگتا ہے بلکہ یہ تو ہمارا ہی جہاز ہے جو پچھلی رات ڈوبا تھا۔ ذرا اس کی چمنی دیکھو۔ بے ناہو بہو وہی! بے شک ہمارا بدقسمت جہاز رات انہیں دندان نما چٹانوں سے ٹکرایا تھا''

ناہید کو ایک امید کی کرن نظر آئی۔ کامران سے پوچھنے لگی ''کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے شکستہ جہاز میں کوئی زندہ آدمی بھی ہو؟'' ناہید کا خیال تھا کہ اگر کوئی باورچی یا بیرا بھی ہوا تو کامران کا غلبہ بہت پتلا ہو جائے گا، بلکہ بہتر تو یہ ہو کہ کوئی عورت برآمد ہو کہ ہماری اکثریت ہو جائے مگر اتنی قسمت کہاں!

کامران کہنے لگا "میرا خیال تو نہیں اس کھنڈر میں کوئی زندہ بچا ہو۔ بہر حال میں دیکھوں گا"

"دیکھو گے؟" ناہید نے حیرت سے پوچھا۔ "کیسے؟"

"وہاں تک تیرتے ہوئے جاؤں گا اور کیسے؟"

"اتنی دور تک؟"

"بالکل۔ یہی کوئی نصف میل کا فاصلہ ہوگا"

"مگر شاید سمندر میں......" ناہید نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ جیسے اسے اچانک یاد آگیا ہو کہ یہ شخص اتنی ہمدردی کا مستحق نہیں۔

مگر کامران ناہید کا مُدّعا پا گیا۔ بولا "تم کہنا چاہتی ہو کہ کہیں سمندر میں آدم خور مچھلیاں نہ ہوں۔ تو بی بی فکر نہ کرو۔ اگر مجھے کوئی شارک مل گئی تو اس قدر شور مچاؤں گا کہ وہ آداب عرض کہہ کر راستہ چھوڑ دے گی اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس نیم غرق جہاز سے ہمیں کیا کچھ مل سکتا ہے۔ کمبل، برتن، ہر قسم کی خوراک بلکہ ممکن ہے ایک کشتی بھی ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ڈھونڈنے والوں کو ہم دنیا نئی دیتے ہیں۔"

"تو کیا تم میرا کارک جیکٹ Cork Jacket" ناہید کچھ کہتے کہتے رک گئی وہ دراصل کامران کو انسانی ہمدردی کے طور پر اپنا کارک جیکٹ دینا چاہتی تھی (جو سمندر میں ڈوبنے سے بچاتا ہے) مگر ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ کامران کہیں اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائے کہ اسے دل دے بیٹھی ہے۔ بہر حال آخر انسانی ہمدردی غالب آئی اور ناہید نے جملہ پورا کیا۔ "تو کیا تم میرا کارک جیکٹ نہ پہننا چاہو گے"؟

"کیوں نہیں" کامران خوش ہو کر بولا۔ "مگر تمہیں کہیں اس کے بغیر زکام نہ ہو جائے۔"

ناہید نے اپنا جیکٹ اس کے حوالے کیا۔ کامران تیار ہو کر ساحل پر جا کھڑا ہوا اور اللہ کا نام لے کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ناہید ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ گئی اور اپنی گول ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹیک کر کامران کے کالے سر کو سطح آب پر آگے سرکتے دیکھنے لگی۔ مگر اب ناہید کا دل ہزار اندیشوں کی

آماجگاہ تھا۔ اگر کامران کی کسی آدم خور شارک سے مڈبھیڑ ہوگئی تو؟ بلکہ عین اسی لمحے ایک خطرناک سا سایہ کامران کا تعاقب کرتا نظر آیا۔ ناہید نے آنکھیں بند کرلیں اور دیر تک بند کئے رکھیں مگر جب کھولیں تو کیا دیکھتی ہے کہ کامران دو چٹانوں کے درمیان نیم غرق جہاز کی چھت پر چڑھ رہا ہے اور اگلے لمحے اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے بخریت پہنچ جانے کے اشارے کئے مگر جواب میں ناہید نے کوئی باز و یا رومال نہ لہرایا بلکہ ریت پر کہنی ٹیک کر اور ہتھیلی پر رخسار رکھ کر دائیں پہلو پر لیٹ گئی۔

کامران کو جہاز سے واپس آنے میں جانے سے بھی کم وقت لگا اور اب اس نے نہ صرف نئے کپڑے پہن رکھے تھے (جو کسی خشک کمرے سے اچک لئے تھے) بلکہ ایک چھوٹی سی کشتی بھی ساتھ کھینچ لایا تھا جو مختلف اشیا سے لبالب بھری تھی۔ کامران کنارے پر پہنچتے ہی چلّایا'' ناہید! ادھر آؤ' ذرا سامان اتارنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ' جلدی اور پھر یہ تمام چیزیں غار میں لے جانا میں ایک بار پھر جہاز کی طرف جارہا ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے۔ کہیں بالکل ہی غائب نہ ہو جائے۔''

ناہید نے بڑے سکون سے سوال کیا'' کیا اس دفعہ مجھے بھی جہاز تک ساتھ لے چلو گے؟''

'' کیوں؟''

'' میں اپنے کیبن سے کچھ چیزیں لانا چاہتی ہوں''

'' تمہارا کیبن تو پانی میں ڈوب چکا ہے اور اس وقت غالباً اس میں مچھلیاں کھیل رہی ہیں۔ جہاز کے صرف چند کمرے پانی سے باہر ہیں اور ان میں سے جو کچھ ملتا ہے' لا رہا ہوں۔ ویسے تمہارے پہننے کے لئے کچھ پارچات مل گئے تو نہایت احتیاط سے چن کر لے آؤں گا۔ میں زنانہ پوشاک کے لئے بڑا نفیس ذوق رکھتا ہوں''

یہ کہہ کر کامران نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور جہاز کی طرف روانہ ہوا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کشتی سے لایا ہوا سامان جہاں چھوڑ گیا تھا وہیں ڈھیر کی شکل میں پڑا ہے اور ناہید صاحبہ بدستور ریت پر بیٹھی گھٹنے پر تھوڑی رکھے گویا فرضی بنے کھیل رہی ہیں۔

کامران بولا'' جہاز غرق ہوا ہی چاہتا ہے۔ میں نکلا تو آخری سانس لے رہا تھا اور کوئی

دس فٹ مزید گہرائی میں پھسل گیا تھا۔ شکر ہے اس سے پہلے تمہارے لئے مچھلی کے ڈبے ڈھونڈ لایا تھا۔ مجھے معلوم ہے مچھلی تمہاری کمزوری ہے...... اور ہاں' یہ سامان جوں کا توں پڑا ہے۔ غار تک کیوں نہیں لے گئیں؟ تھک گئی تھیں؟''

ناہید' جو پچھلے ایک گھنٹے سے اس سین کے لئے اپنا پارٹ سوچتی رہی تھی' نہایت سرد مہری سے بولی'' میں حکم سننے کی عادی نہیں ہوں''

عین اس وقت کامران کشتی سے ایک بھاری ڈبہ نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔ ناہید کا باغیانہ سا جواب سن کر ڈبے پر بیٹھ گیا اور ناہید پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا'' اچھا' تو نافرمانی ہو رہی ہے' سرکشی! بغاوت!! معلوم ہوتا ہے اب کورٹ مارشل کے بغیر چارہ نہیں مگر خیر' چونکہ فی الحال تمہیں گھر بسانے میں میرا ساتھ دینے میں تامل ہے لہٰذا امید ہے تم اتنا کرم ضرور کرو گی کہ غار تک تشریف لے جاؤ گی۔ رہا یہ تمام سامان تو تمہاری خاطر میں یہ تمام اشیاء پیٹھ پر اٹھا کر غار تک پہنچا دوں گا اور ساتھ ساتھ دعا کرتا رہوں گا کہ سامان پہنچ جانے کے بعد تم اس گھر کو اپنے زنانہ حسن و ہنر سے ایک چھوٹا سا فردوس بنا دو گی اور پھر جب میں دن بھر کی مشقت کے بعد گھر لوٹا کروں گا تو مجھے توقع ہو گی کہ تم نے میرے لئے ڈنر تیار کر رکھا ہے۔ میز پر موم بتیاں جل رہی ہیں۔ آتشدان گرم ہے۔ تمہارے چہرے پر تبسم ہے اور ہونٹوں پر خوش آمدید اور رونے یا روٹھنے کا دور دور تک نشان نہیں ورنہ ورنہ تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں ایک خوفناک قسم کا گھریلو بلا کو خاں ہوں''

ناہید حیران ہو رہی تھی کہ یہ مزاح کے پردے میں کامران صاحب محض خوشدلانہ بزمار رہے ہیں یا سچ مچ دھمکی دے رہے ہیں۔ بہرحال وہ غار کی طرف چل پڑی مگر غار کے پاس رکنے کی بجائے پہاڑی پر چڑھنے لگی اور '' نانگا پربت'' کی چوٹی پر جا بیٹھی اور گھنٹوں غروب آفتاب کا نظارہ کرتی رہی۔ اس کے چہرے کی کیفیت کچھ اس نوع کی تھی جس کے لئے کوئی ماہر دائی صرف ایک ہی علاج تجویز کرتی ہے۔

سورج کا قرمزی کرہ سمندر میں اس قدر اچانک گرا کہ سمندر سے بھاپ اٹھنے کا گمان

گزرا۔ ادھر آکاش سے اچانک کالی رات نازل ہونے لگی اور آسمان کے مخملیں پردے پر اَن گنت ستارے پھوٹ نکلے۔

ناہیداں نظاروں میں محوتھی کہ چوٹی سے کچھ نیچے سے آواز آئی''' ساتھی''(Partner)

''نہیں مانوں گی' نہیں مانوں گی' ' ناہید نے دانت بھینچتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ ایک چھوٹا سا خاموشی کا وقفہ گزرا۔ پھر ناہید کو پہاڑی پر چڑھتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور اگلے لمحے میں کامران کا سر اُبھرا۔

کامران فوجی انداز میں سیدھا کھڑا ہو کر بولا: '' کھانا تیار ہے۔ یہاں لا دوں یا نیچے چل کر کھاؤ گی؟

ایک عرض کر دوں کہ اس اونچائی پر کھانا پیش کرنے کی علیحدہ قیمت ادا کرنا پڑے گی۔''

ناہیداس کی بے تکلفانہ دل لگی کے موڈ میں نہ تھی۔ آرام سے کہنے لگی: '' میں نیچے آؤں گی۔''

غار کے دروازے کے باہر آگ جل رہی تھی اور اس پر ایک نامعلوم مگر پُر کشش ترکاری بلبلے نکالتی پک رہی تھی۔ کامران نے صندوق اور پیٹیاں وغیرہ غار کے باہر یعنی صحن میں قرینے سے رکھ دیں تھیں اور غار کے دروازے پر ایک بڑا پردہ تان دیا تھا۔

پہاڑ سے اترتے ہی کامران بولا'' تشریف رکھیں ناہید صاحبہ: یہ ہے آپ کی نشست'' ......

اور نشست کیا تھی؟ جہاز سے لائے چند کشن جو ایک دوسرے پر رکھ دیئے گئے تھے۔

''محترمہ' یہ فقط ایک ڈش کا کھانا ہے'' کامران نے معذرت کے انداز میں کہا'' لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اس غریب خانے کو آپ کے حسن کے ساتھ آپ کے حسنِ انتظام بھی میسر آ گیا تو اس دسترخوان کی فضا شیزانی ہو جائے گی اور ہاں' کیا پینا چاہیں گی؟ میرے پاس کوک ہے، لیمن سکوائش ہے۔ اس کے علاوہ میں آپ کے لئے درجن بھر جنجر ایل کی بوتلیں بھی اٹھا لایا ہوں کہ یہ آپ کا چہیتا مشروب ہے، مگر کچھ نہ پوچھیں: جہاز کے تہ خانے میں ان بوتلوں تک پہنچنے کے لئے مجھے کس مہلک قسم کی قلابازیاں کھانا پڑیں لیکن ان بوتلوں کے استعمال میں اب ذرا

کفایت سے کام لینا پڑے گا۔ یعنی خاص خاص موقعوں پر ایک ایک بوتل۔ مثلاً آپ کی سالگرہ پر' عید پر اور میرے خیال میں آج کی رات بھی خاص موقع کے عنوان کے تحت آتی ہے۔''

پھر ناہید کے گلاس میں جنجرایل انڈیلتے ہوئے بولا: Say When[1]

اسی شگفتہ لے میں چہچہاتے ہوئے کامران نے امیرانہ ضیافت کی جملہ رسوم ادا کیں اور ساتھ ساتھ پیٹ بھر کر کھا بھی لیا اگرچہ ناہید نے چند لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانے کے بعد جیسا کہ آدابِ ضیافت کا تقاضا ہے' کامران نے باقاعدہ سگریٹ پینے کی اجازت مانگی اور اپنا پائپ سلگالیا۔ پھر دھواں اڑاتے ہوئے بولا: خدا جانے' میرا دوپاؤ تمبا کو کب تک میرا ساتھ دے گا۔ شاید ایک مہینہ نکل جائے اور ہاں ادھر دیکھو سمندر میں چاند کا تھرتھراتا عکس پیارا لگ رہا ہے۔''

ناہید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہوا میں نظریں جمائے چپ بیٹھی رہی۔

کامران اٹھ کھڑا ہوا اور بہ آواز بلند اعلان کیا'' سونے کا وقت ہو گیا۔ آپ بہت تھک گئی ہیں آئیں' اپنا بیڈ روم ملاحظہ کر لیں''

ساتھ ہی کامران نے ایک موم بتی جلا کر ناہید کو پیچھے پیچھے آنے کی دعوت دی۔ ناہید نے کچھ بولے بغیر تعمیل کی۔

غار کے سرے پر کامران نے ایک پلنگ کی اونچائی اور لمبائی کے برابر ایک تھڑا سا کھود کر ہموار کر دیا تھا اور اس پر گدوں اور کمبلوں سے ناہید کے لئے ایک بستر ترتیب دیا تھا۔ قریب ہی ایک پتھر پر مین رکھ دیا جسے چلمچی کا کام دینا تھا۔ ساتھ ہی ایک بالٹی دھری تھی جو لبالب پانی سے بھری تھی۔ ذرا ہٹ کر ایک درازوں والی پیٹی رکھی تھی جو بیک وقت کرسی کا کام بھی دے سکتی تھی اور وارڈ روب کا بھی۔

کامران نے موم بتی والا ہاتھ بلند کیا کہ کونے کے جملہ مشمولات پر روشنی پڑے۔ پھر کسی قدر فخر سے ناہید سے پوچھنے لگا: ''کیا خیال ہے جنابِ مہمان کا اس خاکسار کی کارگزاری کے متعلق؟ میں جانتا ہوں بجلی کی گھنٹی اور گرم پانی والی بوتل کی کمی ہے' تو ان کے لئے کل دوپہر تک

---

1۔ مے نوشوں کیلئے ساقی کا سکہ بند انگریزی کلمہ مطلب ''بتاتا گلاس کہاں تک بھروں''

مہلت کا خواستگار ہوں''

ناہید بدستور خاموش رہی

کامران نے موم بتی' غار کے پہلو سے نکلے ہوئے ایک اونچے پتھر پر رکھ دی اور ناہید سے مخاطب ہوا:

''کوئی اور کارِ خدمت جو میں یہاں انجام دے سکتا ہوں؟''

''جی نہیں، شکریہ'' ناہید کا مختصر جواب تھا

''سوچ لو، میں آخری بار پوچھ رہا ہوں''

ناہید کو کامران کی آواز میں ایک عجیب سی کھنک محسوس ہوئی تو اچانک اس کے چہرے پر تکنے لگی اور پوچھا'' آخری بار کیوں؟''

کامران آپ سے تم پر تو آ ہی چکا تھا۔ اب دل لگی کی سطح سے میلوں نیچے اتر کر مکمل سنجیدگی سے بولا بلکہ یوں کہیں کہ گا گیا۔'' اس لئے کہ میں دوبارہ تمہاری تنہائی میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ اس لمحے کے بعد یہ غار تمہارا ہے۔ صرف تمہارا تا کہ تم جب چاہو اس غار میں بلا خوف غیر ٹھہر سکو اور آج کی طرح تمہیں پھر کبھی شک نہ کرنا پڑے کہ یہ شخص کسی شریف آدمی کی طرح ساتھ رہنے کا اہل نہیں۔ بس' مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ شب بخیر۔''

یہ کہہ کر کامران غار کے دروازے کی طرف مڑا۔

'' آپ کہاں رات گزاریں گے؟'' ناہید نے آہستہ سے پوچھا۔

''ساحل سمندر کی ریت پر' سیپیوں اور گھونگوں کے درمیان'' کامران نے چلتے چلتے جواب دیا اور آخر میں ایک بار پھر ایک خشک سی ''شب بخیر'' کہی۔

قاری محترم: آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ کامران کی رخصتی گفتگو کس قدر بچگانہ بلکہ بیوقوفانہ تھی حالانکہ اس کی اس شام کی کارکردگی اور رخصتی گفتگو سے پہلے کے ڈائیلاگ یکسر دلربا تھے۔ وہ اسی خوش طبعی سے شب بخیر کہہ کر اپنی شخصیت کو ایک ہیرو کا رنگ دے سکتا تھا لیکن کامران اندر سے ایک ایسا

شخص تھا جو ایک محبت بھرے دل کے باوجود اپنے غصے پر کبھی غالب نہ آ سکا۔ چنانچہ آج شب کے آخری ایکٹ کو جس میں ڈرامائی نزاکت آ سکتی تھی اس نے ناحق ضائع کر دیا اک تماشا ہوا' گلہ نہ ہوا۔

اگلی صبح ناہید جاگی تو سورج کی شعاعوں نے دروازے کے پردے کے باوجود غار کو روشن کر رکھا تھا لیکن کچھ دیر کے لئے وہ حیرانی سے آنکھیں ملتی رہی کہ آخر میں ہوں کہاں؟ اور اس بے یقینی کے عالم میں اس کی چیخ نکل گئی۔

ادھر در غار کے پردے پر ایک سایہ نمودار ہوا اور ساتھ ہی ناہید کے کانوں میں ایک خوشگوار آواز آئی۔ ''ایک چیخ پر بندہ حاضر' دو چیخوں پر خادمہ حاضر اور تین چیخوں پر بیرا حاضر۔ ناشتہ تیار ہے' مالکن!''

کامران کا مزاج بحال ہو چکا تھا۔ چند منٹ بعد ناہید ناشتے کی میز پر باہر آ بیٹھی۔ تازہ فرائیڈ فش کھا رہی تھی۔ ایسی خوش تو نہ تھی مگر بے حد بھوکی۔

کامران اپنی دیرینہ خوش مزاجی سے بولا ''جتنا جی چاہے' کھاؤ۔ ہمارے بے وفا جہاز میں ہمارے لئے جگہ تو نہیں لیکن ٹمن بند خوراک اس قدر موجود ہے کہ مہینوں کے لئے کافی ہے۔ مگر تازہ مچھلیاں بھی کبھی نہ ختم ہونے والی نعمت ہے۔ اچھا' اب چائے یا کافی؟''

''مجھے کافی سے نفرت ہے'' ناہید ناخوش ہو کر بولی۔ دراصل کامران کے اس اشارے نے کہ جزیرے میں مہینوں رہنے کا امکان ہے۔ ناہید کو برافروختہ کر دیا تھا لیکن اب کامران کی خوش دلی اس کی پچھلی رات کی تنک مزاجی پر غالب آ چکی تھی۔ مسکراتے ہوئے کلب کے قواعد کی زبان میں ناہید سے مخاطب ہوا۔ ''ممبروں سے التجا ہے کہ کلب کے ملازموں پر غصہ جھاڑنے کی بجائے اپنی شکایت بل کی پشت پر لکھ دیں۔ ان شکایات پر کمیٹی اپنے اگلے اجلاس میں غور کرے گی لیکن مجھے افسوس ہے مس ناہید' آپ کو کافی پسند نہیں۔ بہر حال میں اب ڈوبتے جہاز کی طرف آخری بار جا رہا ہوں اور میری تمام تر تلاش تمہاری خاطر چائے کے لئے ہوگی۔ میرے لئے دعا کرنا۔''

''تو کیا جہاز ابھی تک ڈوب نہیں چکا؟'' ناہید نے آنکھ اٹھا کر پوچھا۔

''بس آخری ہچکی لینے والا ہے مگر ابھی لی نہیں'' کامران بولا۔ ''جہاز سے کوئی چیز چاہئے تو ارشاد''

''مجھے بالوں کے پن Hair Pins چاہئیں'' ناہید نے بالکل غیر متوقع طور پر کہا۔

''ذرا مشکل فرمائش کردی ہے'' کامران نے کان کھجلاتے ہوئے کہا'' کیونکہ وہ چند کمرے جو ابھی ڈوبے نہیں انجینئر لونڈوں کے تھے اور تم جانتی ہو کہ ان کے چھوٹے بال پنوں کے محتاج نہیں ہوتے لیکن ایک بات'' اور بات کہنے سے پہلے اس نے ناہید کی پریشان زلفوں کو ذرا غور سے دیکھا۔

''تمہارے بال پنوں کے بغیر بھی بڑے پیارے لگتے ہیں!''

ناہید کامران کی گزشتہ شب کی زود رنجی کا واقعہ بھولی تو نہیں تھی مگر اس کے تازہ خراج تحسین پر منہ بنانے کی بجائے مسکرادی۔ یہ اس کی جزیرے میں آنے کے بعد پہلی مسکراہٹ تھی۔ یہ دیکھ کر کامران نے اپنے دل میں ایک خوشی کی لہر محسوس کی اگرچہ اسے اب بھی یقین نہ تھا کہ ناہید کی مسکراہٹ مستقل صلح کا پیغام ہے یا محض عارضی جنگ بندی کی علامت! بہر حال امید بہار رکھتے ہوئے بولا: ''تو مجھے اب جانا چاہئے۔ جب میں لوٹا تو پھر رسمی طور پر جزیرے کی حکومت سنبھالیں گے اور ایک مستقل آئین مرتب کریں گے''

آج سمندر کی لہریں معمول سے زیادہ پُر زور بھی تھیں اور پُر شور بھی۔ ناہید نے ہتھیلی کی اوٹ میں سمندر کی موجوں پر نگاہ ڈالی تو کسی قدر پریشانی کے عالم میں بولی''' جہاز تک جانے میں کوئی خطرہ تو نہیں''

''میں پوری احتیاط سے کام لوں گا'' کامران تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم فکر نہ کرو''

''فکر تو مجھے ہوگی'' ناہید کی آواز میں تشویش کا شائبہ تھا۔

''یہ تو بڑی بندہ پروری کی علامت ہے'' کامران نے گویا اپنے کان میں کہا۔

مگر ناہید نے اپنی فکر کی مزید تشریح کردی۔ اگر تم ڈوب گئے تو مجھے غالباً فاقوں سے مرنا پڑے گا یا کم از کم مجھے خود کھانا پکانا اور دھونا پڑے گا۔''

تو یہ سچ مچ عارضی' بلکہ مطلب کی جنگ بندی تھی۔ کوئی پکی صلح نہ تھی۔

بہر حال جب آدھے پونے گھنٹے کے بعد کامران سامان آسائش سے بھری کشتی لے کر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ ناہید نے ناشتہ کی میز سے برتن اٹھا لئے ہیں اور سارا گھر سلیقے سے صاف کر دیا ہے۔

کامران نے آتے ہی جزیرے کی دو رکنی کونسل کا اجلاس طلب کیا کہ صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔ پہلے اس نے جہاز سے لائے ہوئے نقشے پر ناہید کو اپنے جزیرے کے محلِ وقوع کے متعلق بتایا۔ اس پر ناہید چلا اٹھی۔ تو کیا ہم مہذب دنیا سے کوسوں دور پڑے ہیں؟''

''جی ہاں'' کامران نے تائید کی ''اور صرف مہذب دنیا ہی سے نہیں، جہازوں کی گزرگاہ سے بھی اتنے ہی دور ہیں لیکن خیر خدا کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔ یہ اسی کا فضل ہے کہ جزیرے میں ایک میٹھے پانی کا چشمہ ہے۔ وافر مقدار میں خوراک ہے۔ مچھلی اور پھلوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ جب میں شکار کو نکلا تو شاید ایک آدھ کچھوا پکڑ سکوں گا۔ یا کوئی پرندہ مار لاؤں گا۔ اب اگر یہ تمام بیرونی خدمات تمہاری خاطر دل و جاں سے بجا لاؤں تو کیا تم گھر کا انتظام سنبھال لوگی؟''

ناہید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس پر کامران نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور گلا پھاڑ کر چلایا ''واہ وا، زندہ باد میڈم ناہید!......'' خدا جانے اس نے قلابازی لگانے کی خواہش پر کس مشکل سے قابو پایا۔ کچھ دیر بعد کامران کا سانس بحال ہوا تو مستقبل کے منصوبے بنانے لگا۔ ''سب سے پہلے ہمیں ایک جھونپڑا بنانا چاہئے۔ اس کے ایک حصے میں میں سویا کروں گا اور دوسرے حصے میں سامان رکھ دیں گے۔ ہم اس جزیرے کو ایک نظام کے تحت چلائیں گے۔ فوری طور پر میرے ذہن میں کپڑوں کی بات آئی۔ ہمارے موجودہ کپڑے ہمیشہ کے لئے تو نہیں۔ کاش، تمہارا کیبن زیر آب نہ ہوتا کہ میں تمہارے سارے جوڑے بصد احتیاط اُٹھا لاتا، تمہارے کیبن کا نمبر سات تھا نا؟

''ہاں، سات ہی تھا'' ناہید بولی ''تمہارے کمرے کا نمبر کیا تھا؟''

''تین، مگر کیوں پوچھ رہی ہو؟'' کامران نے استفسار کیا۔ ''بس یونہی'' ناہید نے ٹال دیا۔

''اچھا تو ہم کپڑوں کی بات کر رہے تھے۔'' کامران نے اپنا مضمون جاری رکھا۔ ''بھئی

پرانے کپڑے بیکار ہو گئے تو ہم نئے بنالیں گے۔ تمہیں کپڑا کاٹنے کا ہنر تو آتا ہوگا؟''

''مسٹر کامران'' ناہید نے احتجاجاً کہا ''معلوم ہوتا ہے آپ کچھ زیادہ لمبے مستقبل کی فکر میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر گراں نہ گزرے تو ایک عرض کروں؟''

''ضرور ضرور فرمائیے''۔

''اٹھیں' پہاڑی کی چوٹی پر چلیں۔ شاید ناگاہ پربت سے کوئی آتا جاتا جہاز دکھائی دے''

خاتون کے پیچھے پیچھے پہاڑی کی چوٹی کو روانہ ہوئے...... مگر کوئی جہاز نظر نہ آیا...... کامران کو موقع مل گیا۔ ایک محتاط خفگی کے انداز میں کہنے لگا ''دیکھا' بیس منٹ بلاوجہ ضائع ہو گئے اور زندگی اس قدر مختصر ہے۔ چلو' کوئی منصوبہ بندی کریں۔''

ناہید ایک ہلکی سی شکست خوردگی کے عالم میں کامران کے پیچھے پیچھے چوٹی سے اترنے لگی لیکن اس کی تجویز بالکل بے اثر نہ تھی۔ آئین میں ایک شق شامل کی گئی جس کی رو سے کامران کو ہر روز علی الصبح اور غروبِ شام سے ذرا قبل ناگاہ پربت پر چڑھ کر کسی گزرتے جہاز کو تلاش کرنا تھا اور دن کے وقت جب کامران نے شکار کو نکلنا ہوتا تھا' جہاز کی تلاش ناہید کے فرائض میں شامل کر دی گئی۔

باقی وقت گھر کا سامان سجانے میں صرف ہو گیا یعنی وہ عمل جو ہم اپنے شہری مکانوں میں ضروری سمجھتے ہیں' بحرالکاہل کے اس دورافتادہ جزیرے میں بھی اتنا ہی ناگزیر نکلا۔ دوپہر کو ناہید نے کھانا تیار کیا جسے دونوں نے ایک خوشگوار تھکاوٹ کے بعد شوق سے تناول کیا۔ پھر آرام سے گرم ریت پر لیٹ گئے اور بڑی خوشدلی سے باتیں کرنے لگے۔ یوں لگا جیسے دونوں کو آخر احساس ہوا ہو کہ ایک مشترکہ مصیبت دو دلوں کو جوڑنے کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک اچانک ترنگ میں کامران لیٹے لیٹے ذرا ناہید کے اور نزدیک سرک آیا لیکن ساتھ ہی ناہید اتنی ہی اور پیچھے سرک گئی...... اس طرح فطرت جو زہریلی جڑی بوٹیوں کے قریب تریاق کی بوٹیاں اگا دیتی ہے' جنسیات کے نازک توازن کو بھی بڑی حکمت سے قائم رکھتی ہے۔

کامران اٹھا اور اپنی کشتی کی اوٹ میں گدا بچھانے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' ناہید نے پوچھا

بھئی جی چاہتا ہے ذرا سا اے میں کچھ دیر سولوں۔ صبح چار بجے سے قلیوں کی طرح مشقت کر رہا ہوں۔ تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ میں تو کہوں گا تم بھی اپنے غار محل میں جا کر کچھ آرام کرلو۔ ہمیں تندرست اور چاک و چوبند رہنا چاہئے''...... پھر اس کے منہ سے ایک بے ڈھب سا جملہ نکل گیا: ''کاش تمہیں ذرا زیادہ ہم خیال اور خوشگوار صحبت میسر ہوتی!''

یہ کہہ کر کامران کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ناہید کو فراغت تھی۔ کئی گھنٹوں سے ایک خیال اسے ستا رہا تھا چنانچہ وہ اسی خیال کے تحت غار میں گئی اور اپنی حفاظتی پیٹی کا معائنہ کیا جو تہ کی ہوئی بستر کے قریب پڑی تھی۔ جیسے کہ قاری کو یاد ہو گا' پیٹی پر صاف الفاظ میں لکھا تھا ''ملکہ جزائر۔ شاہی کمرہ نمبر 3'' (یعنی کامران کا کمرہ!) ناہید نے پیٹی کو دوبارہ تہ کر کے رکھ دیا اور پھر غار سے نکل کر ناگاپربت پر چڑھنے لگی کہ شاید کوئی جہاز نظر آ جائے۔

گھنٹہ بعد نیچے اتری تو اس کے چہرے کی کیفیت عجیب تھی۔ اگر کوئی ماہر قیافہ شناس اس کا چہرہ دیکھتا تو کہہ اٹھتا ''قصوروار مگر بغیر پچھتاوے کے۔''

جلد ہی اس نے کامران کو جگایا اور پھر اس قدر لذیذ کھانا پکا کر اسے کھلایا کہ کامران ماضی کی تمام ضیافتیں بھول گیا مگر کھانا پیش کرنے میں ناہید نے اس قدر واضح سرد مہری سے کام لیا کہ کامران سے کوئی کم ذہین مہمان بھی ہوتا تو بھوکا اٹھ جاتا...... مگر کامران نے حسب عادت بے تحاشا کھایا اور سیر ہو کر اٹھا۔

کامران جہاز سے مالِ غنیمت میں بیڈمنٹن کا سامان بھی اٹھا لایا تھا۔ جال ریکٹ اور کئی درجن شٹل کاک۔ کوئی دو ہفتے ہوئے بیڈمنٹن کورٹ کی باقاعدہ رسمِ افتتاح ہوئی تھی جو جزیرہ کی خاتونِ اول نے اپنے ریکٹ سے پہلی سروس کر کے انجام دی تھی اور پھر بیڈمنٹن اہلِ جزیرہ کے لئے ایک مسلسل شادمانی ثابت ہوئی۔ کبھی کبھی باقاعدہ ٹورنامنٹ منعقد ہوتی اور کھیل کے اختتام پر تقسیمِ انعامات کی رسم ادا کی جاتی اور حاضرین (جن کی تعداد مستقل طور پر دو تھی...... کی

مشروبات سے تواضع کی جاتی اور شام تک خوش گپیوں میں محو رہتے۔ ایک روز ایسی ہی خوشگوار گفتگو کے دوران کامران نے پوچھا: ''آج ڈنر کے لئے کیا پکا ہے۔''

ناہید نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا: ''کچھوے کے انڈے۔ تلی ہوئی مچھلی اور کیلا..... مگر یہ مچھلی کا ایک چھوڑ کر آخری پین ہے۔''

''اچھا! تو باقی اشیا کی کیا کیفیت ہے؟''

''باقی کسی چیز کی کمی نہیں۔ شروع شروع میں ہم نے کچھ فضول خرچی کی مگر پھر تم اس قدر غضب کے شکاری ثابت ہوئے.....''

''اور تم اس قدر امورِ خانہ داری کی ماہر ثابت ہوئیں''

''کہ ہم خود کفیل ہو گئے۔'' ناہید نے کامران سے مل کر جملہ مکمل کیا اور اس طرح ایک دوسرے کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے جوڑے نے نہایت پیاری مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔

کامران نے مکالمہ جاری رکھا اور اس خوراک نے ہماری نشو ونما پر بھی خاصا مثبت اثر کیا ہے۔ میرا وزن تو یقیناً دس بارہ پونڈ بڑھ گیا ہے اور تم بھی 'نظر بد دور' خاصی تندرست اور پُرکشش نظر آتی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے کامران نے ناہید کو اس غور سے دیکھنا شروع کیا جیسے اسے سطر بہ سطر پڑھ رہا ہو۔

ناہید نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں بڑی پُرکشش لگ رہی تھی۔ یہ وہی سوٹ تھا جو اس نے جہاز سے بچ نکلنے پر پہنا ہوا تھا۔ اس میں وہ پہلی سی آب و تاب تو نہ تھی مگر ناہید کے بدن پر اس میں ایک عجیب دلکشی آ جاتی تھی۔ اس نے گلے میں ایک رنگدار رومال باندھ رکھا تھا۔ نیچے پاؤں ننگے تھے اور اسی وجہ سے قیامت تھے۔ دنیا میں چند ہی پاؤں اتنے خوبصورت ہوں گے۔ بالوں کے پن نہ ملنے کی وجہ سے وہ عام طور پر چٹیا بنا رکھتی تھی مگر بیڈمنٹن کھیلتے وقت وہ اچانک سر کو دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں گھماتی تو اس کے چہرے پر متواتر چٹیا کی چوٹیں پڑتیں، چنانچہ کچھ دنوں سے اس نے بیڈمنٹن کھیلتے وقت بالوں کا جُوڑا بنانا شروع کیا تھا جسے کھیلتے وقت

بحری قذاقوں کی طرح' ساٹن کے فیتے میں محصور کر لیتی۔ اب اس لمحے کہ وہ کھیل سے فارغ ہوئی تھی' اس نے فیتہ اور جوڑا کھول دیا اور اس کے لمبے ریشمی بالوں کی آبشار اس کے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کے کندھوں پر پھیل گئی اور اس کی زلفوں کی چلمن سے اس کی پلکوں کا خم اور اس کے رخسار کی قوس کبھی نظر آتی' کبھی چھپ جاتی...... کامران کی زبان ناہید کی زلفوں کی ستائش میں خاموش شاعری کرنے لگی اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ گزشتہ کئی روز سے اسے اپنی کمزوری...... بے راہ روی؟...... کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ شرافت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک غیر محفوظ خاتون کو ان نگاہوں سے نہ دیکھا جائے مگر......

ناہید گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی ''اچھا تو میں تمہیں بہت تندرست نظر آتی ہوں! شکریہ۔ میں خوش ہوں تمہیں میری فربہی پسند ہے لیکن تمہیں مجھے ان نظروں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی گوشت منڈی نہیں۔''

کامران کا جذباتی دورہ تیزی سے تحلیل ہو گیا اور مضمون بدلتے ہوئے بولا: ''ناہید' معلوم ہے ہمیں اس جزیرے میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟ پورے تین مہینے''

''سچ؟ مجھے تو لگتا ہے کچھ زیادہ وقت ہو گیا ہے'' ناہید نے ارادتاً جھوٹ بولا۔

''اور میرا خیال نہیں کہ ہم نے اتنے لمبے وقت کا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔''

''کیسا فائدہ؟''

''مثلاً یاد کرو رابنسن کروسو کی کہانی: اس نے اتنے عرصے میں کشتی بنالی تھی اور......''

ناہید نے دخل دیتے ہوئے کہا: ''ہمارے پاس پہلے ہی ایک کشتی ہے''

''چلو' کشتی نہ سہی' رابنسن کروسو نے ایک طوطے کو بولنا سکھا دیا تھا''

''اس جزیرے میں کوئی طوطا نہیں'' ناہید نے اوپر دیکھے بغیر جواب دیا۔

''بھئی بات یہ ہے کہ تم میرا مدعا نہیں سمجھ پائی۔ دیکھو نا' ہم تین ماہ سے ایک بیابان جزیرے میں بیٹھے ہیں جو صحرائے نجد کا برادر خورد لگتا ہے لیکن ہماری زندگی میں کوئی مجنونانہ بات

ہی نہیں، کوئی صحرائی قسم کی تفریح ہی نہیں کرتے۔ بس وہی پرانی تفریحات ہیں جو لاہور میں رہتے ہوئے شاہدرہ جا کر پکنک پر کرتے تھے، بلکہ یہاں تو شہریوں کے سے رنگ ڈھنگ ہیں۔ ہر صبح شیو کرتا ہوں۔ تم بال بناتی ہو۔ ٹین بند ڈبوں سے کھانا کھاتے ہیں۔ صبح کچھ کام کرتے ہیں۔ شام بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔ جزیرہ نہ ہوا لاہور ہوا۔ ہم اپنے ماحول کے مطابق نہیں رہ رہے۔ اس زندگی میں کچھ آزادی بلکہ تھوڑا وحشی پن اور ہلا گلا ہونا چاہئے۔ بات سمجھ میں آئی؟''

''جی ہاں! بات تو سمجھ میں آ گئی ہے مگر میرا خیال ذرا مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ مہذب لوگ ایک بیابان جزیرے میں بھی اسی شرافت سے رہتے ہیں جیسے ایک بحری جہاز میں یا لاہور میں۔''

کامران نے جھینپتے ہوئے کانا بدلا: ''میرا مطلب کچھ اور تھا اور وہ یہ کہ ہمیں نیچر کے ذرا قریب زندگی بسر کرنا چاہئے۔ مثلاً ہم دو بکروں کو تاش کی تربیت دے سکتے ہیں یا ایک کچھوا پکڑ کر اسے موسیقی سکھا سکتے ہیں۔''

کامران کی لایعنی باتوں سے ناہید کے ہونٹوں پر روکنے کے باوجود ہنسی آ گئی۔ کہنے لگی: ''کامران، اگر تمہارا پہلا لیکچر...... وہی صحرائی زندگی کے متعلق...... مجنونانہ تھا تو یہ بکرے اور کچھوے والا بیوقوفانہ ہے۔ اگر تمہاری لیکچر بازی ختم نہ ہوئی تو میں اٹھ جاؤں گی۔ کھانا پکانے کا وقت بھی ہونے لگا ہے۔''

لیکن کامران نے اپنا خطبہ جاری رکھا اور ناہید...... کسی قدر لطف اٹھاتے ہوئے...... اپنی پلکوں کی اوٹ سے اسے چوری چوری دیکھتی رہی۔ ایک غیر آباد جزیرے میں، ایک مرد اور عورت، خواہ کتنے ہی مختلف المزاج کیوں نہ ہوں، تین مہینے کے لمبے عرصے میں ایک دوسرے کے جذبات اور خواہشات سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔ کامران کا خیال تھا ناہید اداس رہتی ہے اور وہ اسے کسی طرح شاد و شیریں، نہال اور چونچال کرنا چاہتا تھا مگر کر نہ پاتا تھا۔ ادھر ناہید بظاہر چپ رہتی مگر دل ہی دل میں کامران کی کوششوں سے خوب لطف اٹھاتی۔ آخر کامران کی مخلصانہ تحسین و تواضع کا کچھ تو اثر ہونا چاہئے تھا، چنانچہ ناہید اندر سے ممنون ہی نہ تھی، شاید راضی بھی تھی۔

کامران ایک خوبرو، صحت منداور تیکھے خدوخال کا نوجوان تھا۔ ناہید کے بالمقابل اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کے ہالے میں لئے دیر سے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں ناہید پر جمی تھیں اوراس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔ شاید وہ بہت ذہین نہ تھا اور کچھ ضرورت سے زیادہ خود پسند بھی تھا مگر تھا مرد۔

وہ اچانک ناہید سے ایک سوال پوچھ بیٹھا: ''اچھا بتاؤ' میرے متعلق کیا خیال ہے؟ پورے تین مہینے مجھے ہر رنگ میں دیکھنے کے بعد تمہاری رائے میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں؟''

کامران سوال تو کر بیٹھا لیکن اگلے ہی لمحے پچھتانے لگا۔ اس نے ناہید سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب تک وہ جزیرے میں ہیں وہ ایسے ذاتی سوالوں سے اسے دق نہیں کرے گا۔ اب وہ اپنا وعدہ توڑ بیٹھا تھا اوراس کی وجہ صاف تھی۔ ناہید کی لہراتی زلفیں اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھیں۔ لیکن ناہید نے ذرا بُرا نا مانا۔

بولی: ''جی ہاں' ایک تبدیلی تو آئی ہے اور وہ یہ کہ تم نے یہاں کی مشکلات کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔''

''بھئی' وہ تو جان بچانے کی ذیل میں آتا ہے...... '' کامران نے بولنا شروع کیا

لیکن ناہید نے اپنی بات جاری رکھی: ''اور میں نے چند اور باتوں کے لئے بھی تمہارا شکریہ ادا کرنا ہے۔ ایک تو تم نے میری جان بچائی ہے۔ وہ حفاظتی پیٹی جو اُس صبح میں نے پہن رکھی تھی' تمہاری تھی اور تم ہی نے مجھے دی تھی۔ علاوہ ازیں جب سے یہاں آئے ہیں تمہارا برتاؤ بالکل شریفانہ ہے۔

کامران کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا'' تو کیا تمہیں مجھ سے اس سلوک کی توقع نہ تھی؟''

ناہید نے بھی ذرا رک کر جواب دیا'' بھئی پہلے چند گھنٹوں کے سوا میں نے تم پر کبھی شک نہیں کیا۔ دراصل شروع میں اپنے آپ میں نہ تھی۔ امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔ کر دو گے نا؟''

کامران کو ایک محبت کے ریلے نے آلیا۔ بولا'' جب تم مجھ سے اس طرح کی پیاری باتیں کرتی ہو تو میرا دل چاہتا ہے تمہیں ......اوں' ایں' آں' اوئی۔ اوہ' معاف کرنا''

ناہید کے رخسار گلابی ہو گئے اور کامران جلد ہی سنبھل گیا اور اس نے فوراً مضمون بدلا:

''تو میں ناڑگاپربت چڑھ کر دیکھتا ہوں شاید کوئی جہاز نظر آ جائے۔''

''ٹھیک ہے'' ناہید نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔''مگر ڈنر کے لئے دیر نہ کرنا۔''

کامران چلتے چلتے رک گیا اور ذرا مصنوعی ناراضی سے بولا۔''لیکن تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ تمہارے متعلق میری رائے میں بھی کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں؟''

ناہید نے مختصر سا جواب دیا۔''اس کی ضرورت نہ تھی۔''

اس جواب سے کامران پریشان سا ہو گیا اور پہاڑی پر چڑھتے ہوئے بڑ بڑانے لگا: ''کہتی ہے تمہاری رائے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔'' گویا موصوفہ کو مجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ اللہ میری اتنی ناقدری! حالانکہ میں سمجھا تھا جزیرے میں معاملہ اور آسان ہو جائے گا اور کلہاڑی کی ضرورت ہی نہ پڑے گی مگر اب کیوں نہ کلہاڑی ہی سے کام نکالا جائے...... ارے ارے کامران میاں، صبر، حوصلہ......'' کامران نے اپنے آپ کو سمجھایا اور اپنی بڑبڑاہٹ کو نگل گیا۔

پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو اسے دو میل کے فاصلے پر تین مستولوں والا جہاز دکھائی دیا جو ہولے ہولے جزیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کامران جیسے صحرا گزیدہ کے لئے تو بحری جہاز کی دید نوید عید ہونا چاہئے تھی۔ جہاز دیکھتے ہی اگر وہ خوشی سے اللہ اکبر کے دو چار نعرے بھی لگا لیتا تو بجا تھا۔ کم از کم اسے لکڑیوں کے اس گٹھے کو تو فوراً آگ لگانا چاہئے تھی جو اس مقصد کے لئے پاس رکھا تھا اور قمیص اتار کر لمبے بانس سے باندھ کر جھنڈی کا اشارے پر اشارہ کرنا چاہئے تھا مگر کامران نے ان میں سے کوئی ایک حرکت بھی نہ کی۔ پہلے تو جہاز کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا مگر جونہی اسے محسوس ہوا کہ جہاز کا رخ جزیرے کی طرف ہے، فوراً جھک گیا اور گھٹنوں کے بل نیچے اترنے لگا اور ایک ایسی جگہ پر چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے جہاز تو اوجھل تھا مگر غار کا صحن نظر آتا تھا اور ناہید بھی جو کھانا پکانے میں محو تھی۔ اس نے اپنی آستین کہنیوں سے اوپر تک الٹ رکھی تھی اور اس کے گول گلابی بازو بڑے دلکش لگ رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ ایک میٹھا سا گیت گا رہی تھی کامران نے ناہید کو اس رنگ میں دیکھا اور سنا تو

اس نے جہاز نہ روکنے کا ارادہ پکا کر لیا۔ اس کی نبض تیز ہوگئی مگر ضمیر مر گیا۔ وہ بدستور گھٹنوں کے بل غار کی طرف رینگنے لگا کہ کہیں کھڑا ہونے سے جہاز والے اس کا سراپا آسمان کے پس منظر میں نہ دیکھ لیں...... اتنے میں جہاز جزیرے سے آگے نکل گیا۔

گھنٹہ بھر بعد حسب معمول دونوں کھانے کی میز پر اکٹھے ہوئے مگر خلاف معمول چپ چپ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کامران کا ضمیر ایک اخلاقی انگڑائی کے ساتھ جاگ اٹھا تھا۔ ٹھیک ہے اسے ناہید سے محبت تھی' بے تحاشا محبت' شاید اس ذہین اور چنچل دوشیزہ کے اپنے اندازے سے بھی زیادہ مگر اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ ناہید کے جملہ حقوق کامران کے لئے محفوظ ہو گئے تھے۔ کامران نے تو آج اسے اپنے بنیادی حق' یعنی مہذب دنیا کو لوٹنے اور اس کی مسرتوں سے سرشار ہونے سے محروم کر دیا تھا۔ کامران جتنا سوچتا' اس کا ضمیر اسے اتنی ہی ملامت کرتا۔ اس کا جی چاہا کہ ناہید کے آگے دل چیر کر رکھ دے اور اپنے گناہ کا اقرار کر لے۔

اچانک ناہید بولی: ''کیا بات ہے' آج تم کچھ چہک نہیں رہے؟''

دراصل جزیرے کے آئین میں دونوں نے متفقہ طور پر ایک شق یہ بھی رکھی تھی کہ دن خواہ صلح صفائی میں گزرے یا لڑائی مارکٹائی میں' رات کو کھانے کی میز پر مکمل امن اور لطف و سرور کا دور دورہ ہوگا۔

''تو کیا مجھے لازماً چہکنا پڑے گا؟''

''ہاں' بالکل''

''آج کچھ جی نہیں چاہ رہا''

''تو ذرا ٹمٹما ہی دو!'' ناہید نے اصرار کیا

''آج مجھ سے ٹمٹمایا بھی نہیں جاتا'' کامران نے ایک ناچاری کے عالم میں کہا'' آج تو مجھے چاند سے بھی کوفت ہو رہی ہے۔ دیکھو نا کتنا برا لگ رہا ہے' کتنا کرخت!''

دونوں چاند کی نقرئی طشتری کو دیکھ رہے تھے جس کی چاندنی نے غار کی ریت اور چٹانوں

کو ایک پراسرار رنگ میں نہلا دیا تھا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد ناگاہ ناہید کے سینے سے ایک لمبی آہ نکلی۔ ظاہر تھا کہ چاند نے ناہید کو اپنی رومان انگیز گرفت میں لے لیا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' کامران نے پوچھا

''سوچ؟ ہاں میں سوچ رہی ہوں'' ناہید نے خوابیدہ لہجے میں بولنا شروع کیا

''کہ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ لوگ جو ایک دوسرے کو نہیں چاہتے' ایک دو ماہ کے لئے اس جزیرے میں ڈال دیئے جائیں۔''

کامران فوراً سمجھ گیا کہ ناہید دوسروں ہی کی نہیں' اپنی بات بھی کر رہی ہے' چنانچہ فوراً چہک اٹھا اور پوچھنے لگا: ''تو گویا تمہارے خیال میں لوگ باہم ملنے جلنے سے ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں؟''

''جی ہاں' بالکل'' ناہید نے پورے وثوق سے جواب دیا۔

''حتیٰ کہ مجھ جیسا آدمی بھی؟''

''ہاں' ہاں تم جیسا آدمی بھی......اور مجھ جیسی لڑکی بھی'' ناہید اپنے متعلق کچھ کہتے ہوئے ذرا شرمائی۔

''میرے متعلق تو تم نے بالکل ٹھیک کہا'' کامران نے کہا'' مگر تم تو سالوں میں بھی کسی کے ساتھ سیدھے منہ سے بات کرنے والی نہیں ہو۔''

ناہید نے ایک لمحے کے لئے کامران پر نگاہِ غلط انداز ڈالی اور دیکھا کہ غریب ایک دفعہ پھر اپنی محبوبہ کے رحم و کرم پر ہے لیکن اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ بے چارے کو بالکل ہی چت کر دے۔ تین مہینے کی صحرائی زندگی نے اسے فضول نخروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

کہنے لگی: ''تو تم سچ مچ مجھے اتنا ہی سنگدل سمجھتے ہو؟''

بولا: 'جی ہاں' لیکن مجھے اس موضوع پر کچھ مزید کہنے کا حق نہیں کیونکہ میں نے تمہیں بہت بڑا دھوکا دیا ہے بلکہ میں اپنے جرم کا اقبال کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آج شام جب میں پہاڑی پر چڑھا تو میں نے ایک جہاز دیکھا۔ وہ خاصا قریب تھا اور میں جھنڈی ہلا کر یا آگ جلا کر اسے اپنی

طرف متوجہ کر سکتا تھا لیکن...... میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور اسے جانے دیا۔"

وہ ناہید کے قدموں میں بالکل ساکن کھڑا تھا اور سزا کا منتظر تھا۔

ناہید نے اپنی شفاف بھوری آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں اور پوچھا" کیا وجہ تھی کہ تم نے جہاز کو اشارہ کئے بغیر جانے دیا؟"

"وجہ یہ تھی کہ مجھے تم سے محبت ہے" کامران نے آرام سے کہا۔" میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ موجودہ زندگی کو ختم کرنا بہت بڑا ظلم ہوتا خصوصاً اس وقت کہ......"

"خصوصاً اس وقت سے کیا مطلب؟" ناہید نے پوچھا

"خصوصاً اس وقت کہ تم اس زندگی سے مانوس ہو رہی ہو" کامران نے جواب دیا

"تو کیا واقعی تم نے جہاز کو اشارہ تک نہ کیا؟"

"ہاں"

"بلکہ اپنے آپ کو جہاز سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی کہ اہل جہاز تمہیں دیکھ نہ سکیں"

کامران نے شرمندگی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور بے حد فکر مند لگا۔

ناہید نے اب نگاہیں نیچی کر لیں اور اپنے پاؤں کی انگلیاں دیکھنے لگی۔ آخر بولی:

"کامران! اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو اتنی فکر مند نہ ہوتی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ غار کے پاس سے جہاز میں نے بھی دیکھا تھا اور ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گئی تھی"

کامران یہ سن کر خوشی کے مارے پاگل ہو رہا تھا۔ کیا اس کی محبت یک طرفہ نہ تھی۔؟ کیا دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی؟

وہ چاندنی میں بیٹھے رہے' بیٹھے رہے' بیٹھے رہے۔ کوئی گیارہ بجے کامران نے جھجکتے جھجکتے' مگر پورے احترام سے ناہید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ناہید نے ہاتھ چھڑانے کی نیم دلانہ سی

کوشش کی مگر دراصل نہ وہ ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی نہ یہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ پھر باتیں کرنے لگے۔ کون سی باتیں؟ وہی جو ہر شب کیا کرتے تھے؟ نہیں۔ گزشتہ تین ماہ کی باتوں کا کوئی ایک موضوع بھی آج رات کی سرگوشیوں کا عنوان نہ بن سکا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک نیا ورق الٹ لیا تھا جو بالکل کورا تھا۔ آئندہ اس پر بہت سی ازدواجی تحریروں کا امکان تھا۔ لیکن یہ آنے والے کل کی بات تھی اور کل دیکھی جائے گی۔ آج کی ساعت پھر کبھی آنے کی نہیں تھی...... آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ۔

آخر ناہید اٹھی۔ بولی: ''نیند آرہی ہے۔ جانا چاہیئے۔''

مگر کامران نے دو لمحے اور ٹھہرائے رکھا اور اس کے چمکتے بالوں کی ڈھیلی چٹیا کو سہلاتا رہا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا گویا شکر ادا کر رہا ہو۔ اتنے میں اس کے دائیں کندھے کے نواح سے دبے دبے پیار کے کلمے نکلے۔ ایک لمحے کے لئے وہ کھو سا گیا کہ اس کا سر جو ناہید کے بالوں کے بالکل قریب آچکا تھا' ان کے ریشمی لمس میں الجھ گیا۔

ناہید ایک خمار انگیز آواز میں بولی: ''کاش یہاں میری بہت سی سہلیاں ہوتیں' تاکہ انہیں بتا سکتی کہ......

''ہماری منگنی ہوگئی ہے'' کامران نے جملہ پورا کر دیا

''بالکل'' ناہید نے تائید کی۔ ''بیابان جزیرے میں منگنی کا اعلان عجیب سا لگتا ہے کیونکہ منگنی ہو جائے تو لڑکی ہر ایک کو بتانا چاہتی ہے۔''

''مگر عجیب بات ہے'' کامران بولا ''میں چاہتا ہوں منگنی راز ہی رہے میرا راز! ہمارا راز! اور یہ خوشی ہم دونوں تک محدود رہے۔''

لیکن کامران کی نگاہ اچانک سمندر کی طرف گئی اور اسے کچھ نظر آیا۔ معاً ناہید سے بولا ''تو کیا سچ مچ تم بہت سے لوگوں کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہو؟''

''سچ مچ چاہتی ہوں''

''تو پھر آنکھیں بند کرو اور جب تک میں نہ کہوں' مت کھولنا''

ناہید نے فوراً تعمیل کی اور آنکھیں بند کرلیں۔ کامران نے ناہید کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ گھمایا تا آنکہ اس کا رخ سمندر کی تابندہ موجوں کی طرف مڑ گیا۔ پھر کامران نے ایک جھوٹ موٹ منتر پڑھا۔

''اڑنگ' بڑنگ' ستارے ننگ' کھولو آنکھیں' دیکھورنگ!''

ناہید نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتی ہے کہ سامنے سمندر میں کوئی نصف میل کے فاصلے پر' چاندنی میں جھلملاتا ایک سفید جہاز جزیرے کی طرف آرہا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی ساحل سے آلگا۔ اہلِ جہاز سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ جہاز ان کے میزبان سردار عثمان علی نے کھوئے ہوؤں کی جستجو میں تمام چھوٹے بڑے جزیروں کو دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ دونوں نئے مسافر بلا تاخیر جہاز میں سوار ہو گئے۔

لاہور پہنچ کر کامران کے لئے ناہید کے ساتھ ازدواجی زندگی ایک مسلسل ہنی مون تھا۔ ایک روز گھر کے چمن میں چائے پیتے ہوئے جزیرے کی زندگی کی یادیں تازہ کررہے تھے۔ کچھ سوچ کر کامران بولا۔

''جانم! میں اکثر سوچتا ہوں' ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ پورے تین ماہ جزیرے کے قریب کوئی جہاز نہ گزرا اور مجھے اتنی مہلت مل گئی کہ تمہارے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا کرلیا۔''

''اس میں خوشی کی کون سی بات ہے؟'' ناہید نے متعجب ہو کر پوچھا۔

''بھئی ہے نا'' کامران نے زور دے کر کہا۔ ''فرض کرو جزیرے میں پہلے روز ہی جب تم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھی تھیں' اگر تمہیں کوئی جہاز نظر آجاتا تو پھر؟''

ناہید نے اپنی پیالی ایک طرف رکھ دی۔ اٹھی اور کامران کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر بولی

''جہاز تو مجھے پہلے روز ہی نظر آگیا تھا' کامی!''

اور آخر میں

ایک دیسی مضمون

مُصنّف کے اپنے قلم سے

# جو تو ہم سفر ہے

یہ داستان ہے خفقان مرزا کے ساتھ ہمسفری کی لیکن داستاں سرائی سے پہلے ذرا آپ کا مرزا سے تعارف کرا دیا جائے۔ آپ غالباً انہیں نہیں پہچانتے۔ بجنگ آمد کے شروع میں آپ کی ان سے ملاقات تو ہو چکی ہے لیکن وہ بالکل سرسری اور سطحی سا تعارف تھا۔ آیئے اس تعارف کو کچھ اور گہرا کریں۔

تو یہ ہیں خفقان مرزا' ہمارے پرانے گرائیں اور پیارے یار' قد درمیانہ' جسم پتلا' ذرا بانکا سا گویا لکھنؤ سے بنوایا ہو۔ آنکھیں بظاہر تنگ مگر نگاہ لیزر کی طرح تیز یعنی اگر اپنے مخاطب کے کسی حصۂ بدن پر تھوڑی دیر کے لئے نظریں گاڑ دیں تو سوراخ کر ڈالیں۔ دانت سالم ماسوائے دو سامنے کے دانتوں کے لیکن دوستوں کے اصرار کے باوجود یہ خلا مصنوعی دانتوں سے پُر نہیں کرانا چاہتے۔ فرماتے ہیں سچا سپاہی اپنے زخموں سے شرماتا نہیں۔ ناک لمبی اور ستواں مگر زبان سے بقدر گز بھر چھوٹی۔ یہ طولِ زباں ہی کا فیض ہے کہ مرزا بیدار ہوں اور ان کے سو گز کے نصف قطر میں کوئی سامع ہو تو بلا وقفہ اور اکثر بلا مقصد کلام کرتے ہیں۔ پھر اگر سامع دائرۂ سماعت سے اٹھ بھی جائے تو سلسلۂ کلام میں بیٹھنے میں نہیں آتا بلکہ کلام کرنے کے لئے بیداری بھی ایسی لازمی شرط

نہیں۔ عالمِ خواب میں بھی نہایت فصاحت سے بڑبڑاتے ہیں اور اس دھڑلے سے کہ خود اپنی آواز سے جاگ اٹھتے ہیں اور اپنے آپ سے معافی مانگ کر پھر سو جاتے ہیں۔ الغرض ان کی خواب گاہ میں یہ سلسلۂ سکوت وکلام شب بھر جاری رہتا ہے:

یار کو میں نے' مجھے یار نے سونے نہ دیا

مرزا تقریباً پچاس برس کے پیٹے میں ہیں لیکن ابھی تک شادی نہیں کی۔ یہ نہیں کہ آپ کو صنفِ نازک میں دلچسپی نہیں۔ بڑی گہری دلچسپی ہے۔ فقط یہ کہ صنفِ نازک سے زیادہ انہیں اپنے آپ سے عشق ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انہیں کسی رقیب کا خطرہ نہیں مگر نقصان یہ ہے کہ کسی ممکنہ دلہن کو ان کی رفاقت کا حوصلہ بھی نہیں۔

مرزا کی تعلیم بی اے تک ہے۔ چونکہ وہاں بھٹنڈہ کے راستے پہنچے تھے۔ لہٰذا اردو کے عالم ہیں اور انگریزی کے جاہل۔ مگر دونوں زبانیں یکساں روانی کے ساتھ بولتے ہیں' فقط اس فرق کے ساتھ کہ اُردو سوچ کر بولتے ہیں اور انگریزی بول کر سوچتے ہیں۔ ہر قول یا فعل کی سند میں شعر ضرور پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر چاروں شانے برمحل بیٹھتا ہے۔

آپ کا اصلی نام ریحان مرزا مگر دوستوں میں خفقان مرزا مشہور ہیں...... دشمن اس نام سے تہِ دل سے متفق ہیں...... ویسے مرزا کی خوش خلقی کا یہ عالم ہے کہ اپنے نقلی نام پر بھی اس قدر والہانہ چونکتے ہیں کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں میرے نقلی نام میں موسیقی کی آمیزش ہے اور بلانے والا یا والی کوئی ہو'یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ملکہ ترنم آواز دے رہی ہو۔ ''وے خفقانیا' میری گل سُن جا۔'' ویسے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مرزا پیدائش سے کئی سال بعد تک ریحان رہ چکے ہیں۔ کچھ یوں لگتا ہے جیسے بلوغت کے پہلے حملے کے ساتھ ہی انہیں خفقان چمٹ گیا اور ریحان جھڑ گیا۔

مگر مرزا سچ مچ کے یعنی طبّی نقطۂ نگاہ سے خفقانی نہیں بس ذرا بے وقوفی کی حد تک صاف گو ہیں یعنی......ایک انگریزی محاورے کے مطابق...... بیلچے کو بیلچہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یا کیوں

نہ ایک اردو محاورہ ایجاد کریں۔ چمچے کو چمچہ ضرور کہہ دیتے ہیں اور منہ پر۔ اب کوئی کتنا ہی حقیر چمچہ کیوں نہ ہو، چمار کہلائے لے گا، چمچہ نہیں کہلائے گا۔ سر دیدے گا۔ مگر چمچہ گو کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے گا۔ اب یوں تو مرزا کو اپنے کاغذی پیکر کے پیش نظر ایک بپھرے ہوئے چمچے سے ٹکر لینے سے پرہیز لازم ہے۔ مگر وہ عادتاً بدپرہیزی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مسلسل ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ غالباً آپ کے دو دانت بھی کسی ایسے ہی نامساوی معرکے میں جاں بحق ہوئے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو دو دانتوں کے ضیاع کا کوئی رنج نہیں۔ ان کا قول ہے کہ جو مزہ صاف گوئی میں ہے، دانتوں کی سالمیت میں نہیں۔

مرزا مجھ پر خاص طور پر مہربان ہیں۔ شاید اس لئے کہ میں ان کا نہ صرف قدردان ہوں بلکہ حتی المقدور پاسبان بھی۔ مرزا کی پاسبانی خالی از خطر تو نہیں لیکن خالی از دلچسپی بھی نہیں۔ مرزا کی باتیں ذرا کٹیلی سہی مگر اس قدر رسیلی ہوتی ہیں کہ اگر خدا انہیں رقیب نصیب کرے تو گالیاں کھا کر مکرر مکرر پکارنے لگے۔ نتیجہ یہ کہ جہاں ان کے جسم پر بعض اوقات ذرا ناگوار سی وزنی اشیاء کا نزول ہوتا ہے وہاں ان کے سر پر پھول بھی برستے ہیں اور ساتھ ہی ہمارے بالوں میں بھی چند کلیاں آگرتی ہیں۔ لیکن مرزا خود اس بات سے یکسر بے نیاز ہیں کہ ان کی پشت پر تھاپی نازل ہوتی ہے یا تھپڑ!

## مرزا ٹیکسی میں

پچھلی گرمیوں کا ذکر ہے میں پنڈی کلب میں رہتا تھا۔ جمعہ تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ مرزا آ نکلے اور کسی تمہید کے بغیر کھڑے کھڑے فرمایا:

''چوہدری چلو، مری چلیں۔''

میں ذہنی طور پر مری کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن ابھی اپنے بہانے کو کوئی معقول شکل دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ مرزا بولے:

''اٹھو بھی، نو بجنے والے ہیں''

کہا ''مرزا ہمیں اس کمرے سے نکل کر اوپر کے کمرے میں نہیں جانا' مری جانا ہے جو ساٹھ کلومیٹر دور اور چھ ہزار فٹ بلند ہے۔ کچھ تیاری کی ضرورت ہے۔''

بولے ''کس بات کی تیاری؟ کپڑے اور جوتے تم نے پہن رکھے ہیں۔ ٹیکسی گیٹ سے نکلتے ہی مل جائے گی۔ ہاں اگر صدر ریگن نے تم سے ہیلی کاپٹر کا وعدہ کر رکھا ہے تو دوسری بات ہے مگر اس کے لئے انہیں کانگریس سے منظوری لینا پڑے گی اور مری کی سیر چند سال کے لئے ملتوی ہو جائے گی۔''

مرزا سے بحث فضول تھی اور ظاہر تھا کہ مری کی سیر اٹل ہے۔

کہا ''اجازت ہو تو سویٹر نکال لاؤں؟ مری میں شاید ٹھنڈک ہو گی۔''

بولے ''سویٹر کی اجازت ہے بلکہ گھر میں مرہم پٹی وغیرہ ہو تو وہ بھی رکھ لینا''

میں نے حیران ہو کر کہا ''مرزا ہم مری سیر کو جا رہے ہیں یا جہاد پر؟''

مرزا بولے ''مسلمان کی زندگی مسلسل جہاد ہے خصوصاً آج کل کہ ہم چاروں طرف سے سمگلروں، نوسربازوں اور جیب کتروں سے گھرے ہوئے ہیں''

میرے ناقص فوجی علم کے مطابق متذکرہ بالا تین قسم کے دشمنوں سے جہاد کے لئے محض مرہم پٹی یا روئی اور سپرٹ سے مسلح ہو کر نکلنا کسی قدر ناکافی جنگی تیاری کا مظاہرہ تھا۔ لیکن خفقان سے اس موضوع پر مناظرہ کرتے تو وہ خود ہم ہی سے جہاد کی ابتدا کر دیتے۔ چنانچہ سویٹر کندھے سے لٹکایا' مرہم پٹی جیب میں ڈالی اور گیٹ سے باہر نکلے۔

تھوڑے سے فاصلے پر ایک ٹیکسی رینگتی ہوئی نظر آئی۔ مرزا نے فوراً ٹیکسی کی جانب رخ کرتے ہوئے تالی بجائی لیکن ٹیکسی قریب آئی تو دوسری طرف کھڑے ہوئے ایک نستعلیق سے مولانا ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے لگے۔ مرزا بجلی کی تیزی سے آگے بڑھے، مولانا کو ان کے جسم کے کسی مقام سے پکڑا اور کار سے کھینچ کر باہر کھڑا کر دیا۔

مولانا اس بے حرمتی نکاسی پر لال پیلے ہونے لگے تو مرزا بولے:

''مولانا' معاف رکھئے گا' یہ ٹیکسی ہمارے لئے ہے''

''کیا بدتمیزی ہے؟'' مولانا نے غصے پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹیکسی تک آپ سے پہلے پہنچا تھا۔''

''مگر جناب مولانا'' مرزا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا'' میں نے آپ سے پہلے تالی بجائی تھی۔ آپ ڈرائیور سے پوچھ سکتے ہیں۔''

ڈرائیور نے خفقان مرزا کے تیور دیکھ کر غیر جانبدار رہنا مناسب سمجھا۔ اس پر مرزا نے اسے ایک مزید لقمہ دیا۔

''بھئی دیکھو میاں ڈرائیور...... مولانا کو فارغ کرو۔ ہمیں مری جانا ہے''

ڈرائیور نے مری کا نام سنا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ سارے دن کے لئے ٹیکسی لگ رہی تھی۔ سارا دن میٹر چلنا تھا۔ وارے نیارے ہونے کا امکان تھا۔ اس نے فوراً مولانا پر خط تنسیخ کھینچا اور جھٹ مرزا کے لئے کار کا دروازہ کھولا۔ مرزا تو اگلے لمحے میں کار کی پچھلی سیٹ میں کھب کر بیٹھ گئے مگر مجھے مولانا سے کچھ ہمدردی پیدا ہو رہی تھی۔ پوچھا:

''قبلہ! آپ کو کہاں جانا ہے؟''

بولے'' چاندنی چوک'' اور ساتھ ہی تقریباً اپیل کے لہجے میں فرمایا'' میں گوجر خان کا رہنے والا ہوں۔ وہاں ایک مسجد میں پیش امام ہوں۔ یہاں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔''

میں نے خفقان سے آنکھ بچا کر مولانا سے کہا:

''چاندنی چوک تو ہمارے راستے میں ہے۔ آیئے۔ اگلی سیٹ پر تشریف رکھیں۔ چوک میں اتر جایئے گا۔''

مولانا نے از راہِ تشکر دعا دی لیکن کچھ اس احتیاط سے کہ مرزا اس دعا میں شامل نہ ہوں اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کار چل پڑی۔

مولانا بھی دوسرے مولاناؤں کی طرح صاف ستھرے آدمی تھے۔ سر پر سفید دستار،

کندھے پر پیلے چارخانے کا رومال' چہرے پر داڑھی' آنکھوں میں سرمہ اور بدن کے کسی مقام پر ذرا کم قیمت مگر تیز بو والے عطر گلاب کا چھڑکاؤ۔؟ جس کی پہلی لپٹ سے ہی کار کی آب و ہوا میں انقلاب سا آ گیا اور مرزا نے جیسے حفظ ماتقدم کے طور پر ناک پر رومال رکھ لیا۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ خدایا' چاندنی چوک تک مرزا کو یہ عطر برداشت کرنے کی توفیق بخشنا' ورنہ اس کے منہ سے مولانا کی بوئے پیرہن پر کوئی تبصرہ نکل گیا تو چلتی ٹیکسی میں بلوہ ہو جائے گا۔ لیکن افسوس میری دعا فیل ہو گئی اور مرزا ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے جھٹ بول اٹھے:

''ڈرائیور میاں؛ تمہاری گاڑی سے کچھ بُو سی آ رہی ہے۔ یہ گلاب کی ہے یا کباب کی یا کسی کیڑے مار دوا کی؟''

''خدا جانے'' ڈرائیور مرزا کی بلاغت کو نہ پہنچ سکا یا پہنچ کر مصلحتاً خاموش رہا۔ اس پر خفقان بولے:

''مگر تم کیا سمجھو گے۔ ذرا کھڑکی کھول دو۔ شاید مرنے سے پہلے تازہ ہوا کا جھونکا ہماری نجات کا باعث ہو۔''

ڈرائیور نے کھڑکی کھول دی۔

مولانا سب کچھ سن رہے تھے اور مرزا کی بلاغت کو نہ صرف پہنچ چکے تھے بلکہ اسے اپنی جوابی بلاغت سے سرفراز کرنے والے تھے کہ اتنے میں ایک بھڑ نے مولانا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی جو کھلی کھڑکی سے داخل ہو کر مولانا کے روئے مبارک کا قریبی طواف کرنے لگی تھی۔ مرزا نے بھڑ کو دیکھا تو ہوا کو مخاطب کرتے ہوئے بولے!

''معلوم ہوتا ہے اس بھڑ کو اپنی شامت کار میں کھینچ لائی ہے۔ اللہ کرے بے چاری اس خوشبو سے سلامت نکل جائے''

مرزا نے ایک اور وار کر دیا تھا مگر بدقسمتی (بلکہ خوش قسمتی) سے مولانا خفقان کے طنز سے زیادہ بھڑ کے ڈنک سے خوفزدہ تھے، چنانچہ مرزا سے قطعِ نظر کرتے ہوئے آپ بھڑ سے دست و

گریاں ہونے لگے۔

مرزا نے مجھے کہنی ماری اور بولے:

''ذرا دیکھنا بھڑ اور مولانا کے درمیان معرکۂ خیر و شر''

ظاہر ہے کہ مرزا بھڑ کو خیر کا نمائندہ سمجھتے تھے اور مقابلے کے دوران بھڑ کی تائید میں ہی نعرہ تحسین بلند کرتے رہے۔ اتنے میں گاڑی روکتے ہوئے ڈرائیور نے اعلان کیا:

''چاندنی چوک آ گیا' جناب''

مولانا بدستور بھڑ کے خلاف دفاعی ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے' ایک اضطرار کے عالم میں ٹیکسی سے خارج ہوئے اور ساتھ ہی بھڑ بھی کھلے دروازے سے سیٹلائٹ ٹاؤن کی کھلی فضا میں نکل گئی۔ مرزا فوراً بولے:

''اس بھڑ کی کوئی نیکی اس کے کام آ گئی ہے ورنہ اس غریب کا مولانا کے کیمیائی حملے سے بچ نکلنا ممکن نہ تھا۔''

مولانا نے بھڑ سے فراغت پا کر پہلے اللہ تعالیٰ کی ثنا کی' پھر میرا شکریہ ادا کیا اور پھر مرزا پر دانت پیستے ہوئے بولے:

''معلوم ہوتا ہے اس بھڑ سے آپ کا خونی رشتہ ہے۔ مَری جا کر اپنی عزیزہ کے بچ جانے کی خوشی میں مٹھائی بانٹیئے گا''

مرزا بصد شوق بولے'' انشاء اللہ' ضرور۔ فرمائیں' آپ کا حصہ کس مسجد میں بھجواؤں؟''

مولانا کوئی فوری جواب نہ دے پائے تو مرزا نے مزید استفسار کیا:

''اور گستاخی معاف' مولانا ایک بات تو بتاتے جایئے اگر اس خوشبو کے ساتھ آپ نماز بھی پڑھاتے ہیں تو آپ کے نمازیوں کی یومیہ شہادت کی اوسط کتنی ہوگی؟ دو؟ چار؟ دس؟''

مولانا غصے سے کانپنے لگے۔ اب ان کے پاس ایک ہی جواب تھا جو انہوں نے گلا پھاڑ کر مرزا کو پیش کیا:

''پاجی کہیں کا''

مرزا جھٹ بولے''گوجر خان کا!''

اور ہنس ہنس کر دوہرے ہونے لگے کسی معرکے میں فتح منانے کا مرزا کا یہی انداز تھا۔ ہنسنا اور بے تحاشہ ہنسنا۔ مولانا نے میدان سے پسپا ہوتے ہوئے ازراہ غضب کچھ اور بھی فرمایا لیکن ان کا فرمودہ مرزا کے قہقہوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اتنے میں ڈرائیور نے کسی قدر تیزی سے ٹیکسی آگے نکالی مبادا مولانا تنگ آکر مرزا کا قیمہ بنانے پر تل جائیں (اور تل جاتے تو یہ کوئی مشکل کام بھی نہ تھا)

چھٹی سڑک کے چوک پر پہنچے تو ٹریفک کی بتی لال تھی۔ ٹریفک رک گئی۔ اتفاق سے ہماری ٹیکسی ایک ایسی کار کے پیچھے کھڑی ہوگئی جسے ایک خاتون چلا رہی تھی۔ ٹریفک کی بتی ہری ہوئی تو سب کاریں تیزی سے آگے جانے لگیں مگر جیسا کہ اکثر خاتون ڈرائیوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی کار میں کوئی جنبش نہ آئی۔ یہ کار کی خرابی تھی یا خاتون کی ادا' مرزا جھٹ ٹیکسی سے نکلے اور کار کے پاس جا کر خاتون کے کان کے قریب کچھ کہا اور پھر تیزی سے واپس آنے لگے۔ خاتون فوراً کار سے نکلی اور مرزا کو مخاطب کرتے ہوئے چلا کر بولی!

''ہری کا کچھ لگتا۔ بدتمیز بھٹڑ''[1]

مرزا تیزی سے کار میں داخل ہوئے اور ڈرائیور کو بائیں ہاتھ سے ٹیکسی نکال کر آگے بڑھانے کو کہا۔ جب خطرے کے زون Zone سے نکل چکے تو میں نے مرزا سے پوچھا:

''کیا کہہ دیا تھا خاتون سے مرزا؟ اور یہ ہری کون ہے؟''

بولے''بس اتنا عرض کیا تھا کہ محترمہ اگر آپ کسی کے لئے محوانتظار بیٹھی ہیں تو وہ دوسری بات ہے ورنہ ٹریفک کی بتی تو اس سے زیادہ ہری نہیں ہوگی۔ اتنی سی بات پر وہ لپک کر کار سے باہر آگئیں۔''

---

1۔ ایک نیلے رنگ کے پرندے کا پنجابی نام

میں نے کہا ''مرزا تم نے ایک خاتون کو بھی نہیں بخشا۔ ہم دوسری طرف سے آگے نکل سکتے تھے اور نکل بھی آئے ہیں۔

بولے'' یار کیا بد ذوق' بے رنگ بھنڈ قسم کے آدمی ہو' چھیڑ کا اس قدر رنگین موقع اور اسے ضائع کر دیتا؟ خصوصاً جب چھیڑ بھی خوباں بلکہ خوبانی سے تھی''

کہا'' مگر خفقان میاں! خوبانی کے پاؤں میں سینڈل بھی تھی۔ اگر وہ بھی اس موقع کو رنگین کرنا چاہتی تو بڑی آسانی سے تمہاری کن پٹی کا ایک ننھا سا' خوبصورت سا فصد کھول دیتی''

بولے'' تو کیا ہو جاتا؟ دو قطرے لہو ہی بہتا نا۔ کوئی قیامت تو نہ آجاتی۔ سنا نہیں غالب نے کیا کہا ہے'':

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

پھر مرزا نے خوشی کے ریلے میں اپنے من میں ڈوب کر دو تین بار شعر دہرایا۔ جب ریلا تھا تو آپ کی توجہ ٹیکسی اور اس کے ڈرائیور کا رخ کرنے لگی۔ مرزا ہر لحظہ' کمند بدست' شکار کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ پنڈی کی حدود سے نکلے تو ڈرائیور سیدھا راول ڈیم کے رستے آگے جانے کی بجائے شاہراہ اسلام آباد کی طرف مڑنے لگا۔ اس طرح مری کا سفر شاید چند کلومیٹر لمبا ہو جاتا لیکن سڑک نہایت صاف ملتی۔ مجھے یہ رستہ بالکل موافق تھا لیکن مرزا نے چلتی گاڑی سے ڈرائیور کو ایک طرف ٹھہرنے کا حکم دیا اور بولے۔

''دیکھو میاں ڈرائیور: آگے جانے سے پہلے تمہاری پالیسی کی وضاحت ہو جائے تو اچھا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم منزل مقصود پر قریب ترین رستے سے لے جانے کے عادی ہو یا گراں ترین رستے سے؟''

ڈرائیور بولا: ''صاحب میں تریں تریں تو نہیں سمجھتا۔ ویسے آپ کو جس رستے سے جانا ہے' حکم کریں''

ڈرائیور نے تو حتی المقدور بات ادب سے کی تھی مگر مرزا کو بات کے کسی کونے میں گستاخی کا شائبہ نظر آیا۔ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں جمع مخاطب کے صیغے میں بولے

''تو حضور ترین ترین نہیں سمجھتے مگر بیس میل کا فالتو چکر لگانا سمجھتے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو موڑیئے ٹیکسی اور چلئے سیدھے راستے سے۔''

ڈرائیور نے یہ مشتبہ سا خراج عقیدت پانے پر خفقان کو ایک لمحے کے لئے گھورا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا اور ٹیکسی کا رخ راول ڈیم کی طرف کرتے ہوئے چل پڑا۔ بہر حال مرزا کے طرز خطاب نے ڈرائیور کو کسی قدر متزلزل کر دیا، چنانچہ ایک دو مرتبہ ٹیکسی مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑیوں سے بال بال بچی۔

مرزا کی اردوئے معلیٰ پھر پھڑک اٹھی اور ڈرائیور سے گویا ہوئے:

''ڈرائیور میاں: موت و حیات تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن کیا تم براہ کرم بتا سکو گے کہ موت کے ضمن میں آج تک تم نے عزرائیل کی کتنی اعانت کی ہے؟''

ڈرائیور کہہ تو سکتا تھا کہ اگر آج ٹکر ہو گئی تو عزرائیل کی دستگیری میں مجھ سے زیادہ آپ کا ہاتھ ہو گا مگر عقلمند آدمی تھا۔ خاموش رہا اور کار چلانے میں مگن رہا۔ لیکن اس خوف سے کہ ڈرائیور سے نوک جھونک مہلک ثابت ہو سکتی ہے' میں نے مرزا سے کہا

''مرزا' باتیں کرنا ہیں تو مجھ سے کرو۔ ڈرائیور کو یکسوئی سے کار چلانے دو اور وہ بہر حال تمہاری فلسفہ آمیز گفتگو نہیں سمجھ سکتا۔''

مگر مرزا اس مضمون کو آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ بولے:

''یار ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یہ ٹیکسی جتنی آہستہ چلتی ہے' اس کا میٹر اتنا ہی تیز چلتا ہے۔ اس ضمن میں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں ڈرائیور کو ایک دوستانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

میرا اجازت دینا یا نہ دینا بے معنی تھا۔ اگلے لمحے میں مرزا کا روئے سخن براہِ راست ڈرائیور کی طرف تھا۔ بولے:

''ڈرائیور میاں' اولمپک کھیلوں میں تیز رفتاری کے مقابلے ہوتے ہیں کبھی تم نے اپنے میٹر کو ان مقابلوں میں شریک کرنے کے متعلق سوچا ہے؟''

یہ ڈرائیور کی پشت پر آخری تنکا تھا۔ تنگ آکر (مگر بظاہر مسکرا کر) بولا:

''جناب عالی' میرے میٹر کی بجائے اگر آپ اپنی زبان کو مقابلے میں بھیج دیں تو یقیناً گولڈ میڈل لے کر لوٹے گی۔''

ڈرائیور کی غیر متوقع حاضر جوابی نے مرزا کو ایک لمحہ کے لئے ''ناک آؤٹ'' کر دیا۔ میں تو خیر اپنا قہقہہ نہ دبا سکا...... بلکہ کچھ سرور بھی حاصل کیا...... خود مرزا بھی سنبھلے تو اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ رسیلی چٹکیلی بات خواہ دشمن کے منہ سے ہی کیوں نہ نکلے' مرزا داد دینے میں بخل نہیں کرتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے:

''بھئی آدمی خوش مذاق ہے''

پھر ڈرائیور سے مخاطب ہوئے'' لکھے پڑھے لگتے ہو میاں' منشی فاضل ہو؟''

ڈرائیور بولا ''نہیں جناب' تھوڑا سا انسان فاضل ہوں۔ ایک مدت سے ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ ہے''۔

مرزا جمائی آجانے کی وجہ سے ڈرائیور کا آخری جملہ پوری طرح نہ سن سکے۔ پوچھنے لگے:

''کیا کہا ڈرائیور میاں' کس کا تجربہ ہے؟''

ڈرائیور تو چپ رہا مگر مجھے شرارت سوجھی اور کہا:

''مرزا' یہ تمہارا ذکر نہیں کر رہا۔ انسانوں کی بات کر رہا ہے۔''

یہ سن کر ڈرائیور کے منہ سے روکنے کے باوجود چھوٹا سا قہقہہ نکل گیا جو سیدھا مرزا کو جا لگا اور مرزا خفا ہو کر ٹیکسی کی چھت کو جا لگے۔ بگڑ کر بولے: ''کیا معنی کہ تم دونوں مجھے خارج از انسانیت سمجھتے ہو؟''

ڈرائیور جو یقیناً لکھا پڑھا آدمی تھا' جھٹ بولا:

"نہیں جناب، میری تو یہ مجال نہیں۔ آپ تو میرے بڑے فاضل بزرگ ہیں۔"

مرزا کو لفظ بزرگ موافق تو نہ آیا مگر بہر حال ڈرائیور کی معذرت قبول کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے:

"اور حضور کا اس خاکسار کی انسانیت کے متعلق کیا نظریہ ہے؟"

میں نے کہا: "مرزا! ایسے فنی فاضلانہ سوال کر کے کیوں کانوں میں گھسیٹتے ہو؟ مذاق میں کچھ کہہ دیا تھا ورنہ میں تو تمہیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہوں"

مرزا نے میرے مبالغے پر ایک آنکھ بند کر کے لحہ بھر توقف کیا اور پھر ہمیں بھی معافی دے دی...... ڈرائیور کی چوٹ کے بعد مرزا کا انداز مدافعانہ سا ہو گیا تھا۔ خفگی کے بعد خلاف معمول جلد ہی راضی ہو جاتے تھے، چنانچہ ٹیکسی میں وہی دیرینہ پُر امن بقائے باہم کا ماحول لوٹ آیا۔

کمپنی باغ پہنچے تو ٹیکسی کا انجن ذرا زیادہ گرم ہو گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے ریڈی ایٹر کے منہ میں پہاڑی پانی کا نلکا چھوڑ دیا۔ مرزا کو سردی لگ رہی تھی وہاں گرم چائے کا نلکا تو نہ تھا مگر گرم چائے ضرور تھی۔ میں مرزا کو چائے خانے میں لے گیا اور بھاپ چھوڑتی چائے کی ایک لبالب بھری پیالی ان کے آگے رکھ دی۔ پیالی کی دید نے ہی مرزا کو گرما دیا اور جب دو چار گھونٹ پی چکے تو ساری خفگی جھاڑ کر چہکنے لگے اور لگے چٹکلے پر چٹکلا چھوڑنے......

دس بارہ آدمی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ باتوں باتوں میں بہشت اور دوزخ کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک بزرگ دعائیہ لہجے میں بولے:

"یا اللہ، دوزخ کی آگ سے بچانا اور بہشت میں جگہ دینا۔"

مرزا جھٹ بولے! آمین، مگر میں ذاتی طور پر بہشت اور دوزخ سے کسی ایک کو ترجیح نہیں دے سکتا۔"

بزرگ حیران ہو کر پوچھنے لگے: "کیا وجہ؟"

مرزا بولے: "وجہ، میرے مہربان بزرگ! یہ ہے کہ ان دونوں مقامات پر میرے دوست

رہتے ہیں۔''

مرزا کی نکتہ آفرینی پر حاضرین ہنس دیئے اور تحسین کے انداز میں انہیں دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک لکھ پتی مگر بدشکل سا سیٹھ اپنی مرسڈیز کار سے اتر کر ریستوران کے دروازے پر آکھڑا ہوا اور دکاندار سے ایک اعلیٰ قسم کے ولائتی سگریٹ طلب کئے۔ جب دکاندار نے کہا جناب یہ سگریٹ تو میرے پاس نہیں تو سیٹھ نے برہم ہوکر اپنی زشت روئی کو مزید جلا بخشی۔ مرزا نے سیٹھ کو دیکھا تو جھٹ چٹکلا چھوڑا۔

''دوستو! یاد رکھو خدا کو دولت سے نفرت ہے۔ کتنی نفرت؟ اس کا اندازہ ان لوگوں کی شکل و صورت سے لگائیے جنہیں خدا یہ دولت دیتا ہے۔''

حاضرین نے اب کے قہقہہ لگایا جس پر لکھ پتی سیٹھ نے بھی کان کھڑے کئے مگر اسے معلوم نہ تھا کہ اس لطیفے کا ہیرو وہ خود تھا۔

مرزا کی ساتھ کی کرسی پر ایک شخص مونگ پھلی سے بھرا پیکٹ اٹھائے مونگ پھلی کے دانے ٹھونگ رہا تھا۔ اس نے خوش ہوکر تواضع کے طور پر مرزا کو مونگ پھلی کا پیکٹ پیش کیا۔ مرزا نے شکریے کے ساتھ عذر کیا اور کہا:

''جناب مجھے مونگ پھلی نہ کھلائیے۔ مری جا کر کھانا کھانا ہے۔ اگر کچھ مونگ پھلی کھالی تو ساری بھوک غارت ہو جائے گی۔''

اس شخص نے عقیدت مندانہ اصرار کے ساتھ کہا:

''چلیں! ایک دانہ ہی لے لیجئے''

''نہیں جناب'' مرزا نے جواب دیا'' دنیا میں کوئی ایسا مائی کا لال نہیں جو مونگ پھلی کا ایک دانہ کھا کر بس کردے۔''

حاضری نے مرزا کی بچی مگر دلچسپ بات کی کھل کر داد دی۔ اب مرزا محفل کو رنگ پر لے آئے تھے۔ تمام لوگ کسی اگلے چٹکلے کے لئے ہمہ تن گوش بیٹھے تھے اور مرزا نے لطیفے کا آغاز بھی

کر دیا تھا۔

''ایک تھا ڈاکٹر......''

لیکن اتنے میں خدا جانے مرزا کو سڑک پر کیا نظر آیا ان کا رنگ فق ہو گیا۔ آہستہ سے میرے کان میں کہا:

''چوہدری اٹھو اور بھاگو''

اور خود مجھ سے بھی پہلے ریستوران سے چھلانگ لگا کر اپنی ٹیکسی کی طرف لپکے میں پیچھے پیچھے دوڑتا ہو چلا آیا:

''مرزا ہوا کیا ہے؟ کہانی تو ختم کر لی ہوتی۔''

لیکن اس وقت مرزا ٹیکسی کا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر گھس رہے تھے اور عین اسی لمحہ ایک زنانہ جوتا تیر کی تیزی سے ٹیکسی کے نیم وا دروازے سے ٹکرایا اور مرزا مجروح یا مقتول ہونے سے بال بال بچے۔ میں نے بھاگنے کے دوران پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ پاپوش انداز ایک خاتون ہے جو ایک غضب کے عالم میں ٹیکسی کی جانب پیش قدمی کر رہی ہے۔ میں نے مرزا سے پوچھا:

''مرزا کون ہے یہ دشمنِ جان؟ اور کیا عداوت ہے اسے ہم سے؟''

مرزا بولے ''ارے پہچانا نہیں اسے؟ یہ وہی پنڈی والی خوبانی ہے''

میں پیچھے مڑ کر اسے دیکھنے لگا تو مرزا اضطرار میں بولے:

''یار پیچھے دیکھنے کا وقت نہیں اندر بیٹھو کہ بھاگ نکلیں''

مگر پیشتر اس کے کہ میں دروازہ بند کرتا۔ ایک اور سینڈل میزائل کی طرح فضا کو چیرتا ہوا کار میں داخل ہوا جس نے میرے کندھے کو ذرا مس کرنے کے بعد مرزا کی کنپٹی کو بھرپور شرفِ نزول بخشا۔ چوٹ غالباً معمولی تھی۔ مرزا نے کچھ ہائے وائے کئے بغیر ڈرائیور کو کہا کہ ہاں بھئی بھاگو۔

پھر مرزا کی شاباشاں اور انعام کے وعدوں کے جواب میں ڈرائیور نے ٹیکسی کو اس برق رفتاری سے دوڑایا کہ اگر مرزا کے پاس گولڈ میڈل ہوتا تو ٹیکسی کے میٹر کے گلے میں ڈال

دیتے۔ ویسے مرزا احتیاطاً ہر لحظہ پیچھے دیکھ رہے تھے کہ کہیں وہ جنگجو حسینہ تعاقب میں نہ ہو مگر غالباً ایک سینڈل کی کمی کی وجہ سے اس نے تعاقب ترک کر دیا تھا، چنانچہ مرزا نے میدان خالی دیکھ کر سکون کا ایک لمبا سانس لیا اور سیٹ سے مالِ غنیمت یعنی سینڈل اٹھا کر اس کا کسی قدر پیار سے معائنہ کرنے لگے اور پھر اسے ایک آبگینے کی طرح سنبھال کر بیگ میں رکھ لیا۔ یوں لگا جیسے مرزا آج کے واقعہ کو بھی فتح شمار کر رہے تھے۔ سینڈل مرزا کے نزدیک ایک قابلِ فخر ٹرافی تھی۔

اتنے میں مرزا کی کنپٹی اور سینڈل کے مقامِ اتصال پر خون کا ایک ننھا سا قطرہ پھوٹا۔ میں نے مرزا کو بتایا تو مسکرا کر بولے۔

''کوئی بات نہیں۔ تھوڑا سا مرہم لگا دو اور اوپر سفید پٹی کی ننھی سی صلیب چپکا دو۔ خوبصورت لگے گی۔''

میں تعمیلِ ارشاد کر چکا تو مرزا کنپٹی کو آئینے میں دیکھ کر اور موج میں آ کر گنگنانے لگے:

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مرزا کی گنگناہٹ جاری تھی کہ مَری آ گئی اور ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پر جا ٹھہری۔ مرزا کے نزدیک آج کا سفر بڑی کامیابی سے انجام پذیر ہوا تھا، چنانچہ خوشی کے ریلے میں انہوں نے ڈرائیور کو کرائے کے علاوہ نہ صرف انعام دیا بلکہ اس کی پیشانی پر بوسہ بھی دیا۔ میں نے حیرت میں ابرو اٹھائے تو مرزا بولے:

''بھئی' یہ حق تو خوبانی کا تھا مگر وہ تو اب ہے نہیں۔ سو بوگوشے کو ہی دیدیا کہ آج اس شخص نے بھی ہمارا دل خوش کیا۔''

مرزا یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ہماری ٹیکسی کے برابر ایک اور کار آ کر رکی اور اس کا ڈرائیور ایک طوفانی تیزی سے باہر نکلا۔ نکلا کہاں' نکلی' اپنی خوبانی تھی۔

خوبانی اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولی:

''کہاں ہے میری جوتی؟''

مرزا آرام سے کار سے نکلے پہلے اپنے کپڑوں کے بل ہموار کیئے۔ پھر خوبانی کے سامنے کورنش بجالائے اور گویا ہوئے:

''حضور کی نعلینِ نگاریں خاکسار کے بقچۂ مخملیں میں خلوت گزیں ہیں۔''

''کیا' کیا' کیا' کیا؟'' خوبانی نے حیرت اور نخوت میں ڈوب کر پوچھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ خفقان اپنی فارسی' عربی اور اردو کے ملغوبے کا ایک مزید چھینٹا دے کر خوبانی کو شرابور کر دیتے' میں نے آگے بڑھ کر کہا:

''محترمہ! مرزا صاحب کا مطلب ہے کہ آپ کی جوتی ان کے سوٹ کیس میں ہے۔''

اس پر مرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوبانی نے جھٹ مجھے کہا:

''تو یہ سیدھی بات کیوں نہیں کرتا؟ ریں' ریں' ریں کیئے جاتا ہے۔''

اور پھر' بغیر کسی وقفے کے' مرزا کو براہِ راست خطاب کرتے ہوئے بولی:

''نکالو میری جوتی' میاں لنگوٹے۔ فوراً''

جواب میں مرزا' خوبانی کے بجائے مجھ سے مخاطب ہوئے:

''چوہدری! بی خوبانی کو بتا دو کہ شرفاء سے ہمکلام ہونے کا یہ طریقہ نہیں۔''

پیشتر اس کے کہ میں پیام رسانی کا فرض ادا کر سکتا' خوبانی کا پارہ ایک جھٹکے سے عازمِ فلک ہوا اور ایک غضب کے عالم میں مرزا سے جواب طلب کرنے لگی:

''کسے کہہ رہے ہو خوبانی؟ اور ہوتی کیا ہے یہ تمہاری خوبانی؟''

مرزا آہ بھر کر بولے'' کاش وہ ہماری ہوتی! اور جہاں تک کیا کا تعلق ہے تو محترمہ! خوبانی خوباں سے مشتق ہے۔''

بی خوبانی کے پلے کچھ نہ پڑا۔ تنک چڑھے انداز میں پوچھنے لگی:

''خوباں سے کہاں تک ہے؟''

اس پر مرزا مجھے آنکھ مارتے ہوئے گنگنانے لگے:

''سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست''

خوبانی نے کسی قدر بے بس ہو کر مجھے کہا:

''خدا جانے یہ کیا ہذیان بک رہا ہے۔ اسے کہہ دیں میری جوتی نکالے ورنہ میں پولیس کو خبر کرتی ہوں۔''

مجھے فکر ہوئی کہ کہیں آج کا دن مَری کی سیر کی بجائے تھانے کی تفریح میں نہ گزر جائے، چنانچہ میں نے مرزا کی سمت ایک خاموش التجا کی کہ خوبانی کو اس کی جوتی لوٹا دیں مگر مرزا تمام فکرِ قید و بند سے بے نیاز، خوبانی کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے:

''چوہدری! محترمہ کے گوش گزار کر دو کہ ہم بھی ان کے شانہ بشانہ تھانہ روانہ ہوں گے۔ مابدولت کو بھی رپٹ لکھوانی ہے کیونکہ ایک قتالہ نے ہمیں ضرب شدید بہ ارادۂ قتلِ عمد پہنچائی ہے اور یہ کہ آلۂ قتل ہمارے بقچے میں محفوظ ہے۔''

مرزا کا بیشتر کلام بلاغتِ نظام خوبانی کے سرِ پُرغرور سے گزر گیا، چنانچہ اس نے مرزا کی بلاغت کو ایک گھٹیا سا انگریزی نام دے کر مجھ سے پوچھا:

''کیا مطلب ہے اس کے Rigmarole (رطب و یابس) کا؟''

عرض کیا ''سادہ الفاظ میں یوں سمجھیں کہ آپ کی جوتی سے انہیں چوٹ آئی ہے اور یہ تھانے جا کر آپ کے خلاف پرچہ دینا چاہتے ہیں۔''

معاً خوبانی کے نچلے ہونٹ میں خفیف سی کپکپی پیدا ہوئے۔ ارے! کیا خوبانی سچ مچ ڈر کر کانپ رہی تھی؟ معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا تھا کیونکہ ساتھ ہی خوبانی کے کسی مقام سے پارہ گرنے کی آواز بھی آئی...... بے شک خوبانی مدافعت پر مجبور ہو گئی تھی، چنانچہ بامِ فلک سے بسرعت تمام اترتے یا لڑھکتے ہوئے سطحِ زمین بلکہ کسی کھائی سے مرزا سے ہمکلام ہوئی۔

''او ہو، چوٹ لگ گئی تھی آپ کو؟ تو بتایا کیوں نہیں؟ دکھائیں ذرا زخم''

ہمیں یہ اندازہ نہ تھا کہ خوبانی اتنی میٹھی اور رسیلی ہو سکتی ہے اور اس پھرتی سے مرزا سمجھ

گئے کہ دشمنِ جان نہ صرف ہتھیار پھینک چکی ہے بلکہ تھوڑی سی پیش دستی بھی کرلے گی۔ چنانچہ مرزا نے ایک چھوٹی سی شاعرانہ پیش دستی کر ہی ڈالی اور کہا:

''تو آپ زخم دیکھنا چاہتی ہے؟ نمک پاشی کے لئے؟''

''نہیں جی۔ ڈریسنگ کے لئے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے ڈاکٹر ثروت کہتے ہیں۔''

محترمہ نے شاعرانہ پیش دستی برداشت کرلی تھی اور مزید یہ کہ نہ صرف طبیبانہ خدمات پیش کردی تھیں بلکہ رضا کارانہ طور پر اپنے تعارف سے بھی نواز دیا تھا۔ زخم کا معائنہ کرچکیں تو اچانک بولیں:

(ذرا ٹھہریں)

اور بھاگ کر اپنی کار سے فسٹ ایڈ کا تھیلا نکال لائیں۔ اس لمحے مرزا ایک اور فتح سے دوچار ہورہے تھے، چنانچہ کسی قدر سرپرستانہ التفات سے خوبانی سے مخاطب ہوئے:

''تعارف کا شکریہ مس ثروت۔ خاکسار کو ریحان مرزا کہتے ہیں اور یہ ہیں میرے ساتھی چوہدری خوشی محمد''

خوشی محمد کہتے ہوئے مرزا کا اشارہ اس خاکسار کی طرف تھا۔

جواب میں خوبانی نے ہم دونوں کی سمت میں ایک خوشامدانہ مگر خاصی دلبرانہ مسکراہٹ چھوڑی۔ اس کے بعد زخم اور گلے دھل چکے اور پٹی بندھ چکی تو مرزا نے اپنے سوٹ کیس سے جوتی نکالی اور کمر سے جھکتے ہوئے اس کی مالکہ کے قدموں میں ڈال دی۔ اس خیر سگالی کے ماحول میں طرفین کا پولیس سے رجوع سراسر بے محل تھا' چنانچہ دونوں فریق کھانے کی بجائے ہوٹل کی استقبالیہ کی طرف چل پڑے جہاں اپنے میزبانوں سے خوش آمدید و مصنوعی مسکراہٹیں وصول کرنے کے بعد رجسٹر میں اپنے کوائف لکھوائے۔ یہ ہو چکا تو استقبالیہ کلرک نے کمرہ نمبر 25 کی چابی ایک بیرے کو تھمائی اور بیرا ہمارا سامان اٹھائے اور ہماری دُمی انگلی پکڑے کمرے کو چل پڑا خوبانی ہمیں ٹاٹا کرتی ہوئی دوسری سمت میں کسی کمرے کو چل دی۔

ہمارا کمرہ بظاہر صاف ستھرا تھا لیکن مرزا اندر قدم رکھتے ہی رک گئے اور ٹھوڑی اٹھا کر۔ ناک کے راستے'' جیٹ طیارے کی طرح'' کمرے کے چاروں کونوں اور چھت سے ہوا کھینچنے لگے۔ جیسے ایک ہی سانس میں سالم کمرہ سونگھ رہے ہوں۔

میں نے یہ منظر دیکھا تو کہا:

''مرزا صاحب آہستہ سونگھیں۔ کہیں چھت ہی نہ نیچے کھینچ لائیے گا۔''

مرزا میری طرف دیکھے بغیر' بڑے تحمل سے ناصحانہ انداز میں بولے:

''برخوردار' جس بات کی سمجھ نہ ہو اس میں دخل نہیں دیا کرتے۔''

اور سونگھنا جاری رکھا۔ یوں جیسے شرلک ہومز کے متبنیٰ ہوں۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور کہا:

''مرزا' آخر سونگھ کیا رہے ہو؟ مجھے تو کوئی بو وغیرہ نہیں آ رہی۔''

بولے'' تمہاری قوتِ شامہ کند اور ذوقِ لطافت باطل ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ خاموش رہنا کتنا بڑا وصف ہے۔''

میں نے فوری احتجاج کیا'' خدانہ کرے میں سونگھنے کی قوت سے بے بہرہ ہوں۔''

بولے'' میاں' خدا نے تو یہ کر بھی دیا ہے مگر یہ اس کا احسان ہی سمجھو۔ خوشبو ہو یا بدبو' تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ خدا نے تمہیں بڑی غیر جانبدار ناک دی ہے۔''

کہا'' لیکن مرزا' حد سے زیادہ جانبدار ناک بھی تو عذاب ہو جاتی ہے۔ مثلاً تمہاری!''

بولے'' ارے بے خبر۔ حساس ناک قدرت صرف چیدہ لوگوں کو عطا کرتی ہے۔ بہر حال تمہاری ناک سونگھنے کا آلہ نہیں۔ لہٰذا یہ ضائع بھی ہو جائے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔''

میں جھنجھلایا اور بولا'' چشم بددور۔ میری ستواں ناک کیوں ضائع ہو جائے۔ سونگھے نہ سونگھے' اس کے ساتھ' چہرہ کس قدر خوشنما لگتا ہے''

بولے'' ارے چوہدری' جانے بھی دو۔ تمہارے چہرے کی خوشنمائی نے کون سا تیر مار لیا ہے؟ خوبانی نے تو تمہیں کوئی گھاس نہیں ڈالی۔ حالانکہ تمہاری ستواں ناک دن بھر تمہارے

چہرے پر ہی تھی۔''

میں نے کچھ سوچا اور کہا'' تو یہ ساری بدنصیبی خوبانی کی تھی' میرا کیا بگڑا؟ ویسے خوبانی نے تو آپ کو بھی کوئی خاص چارا نہیں ڈالا حالانکہ آپ نے بھی اپنی حساس ناک آج چہرے سے نہیں اتار پھینکی تھی۔''

بولے'' اگر تم دو پیار کرنے والوں کی پُر اسرار باتیں یا مرہم پٹی کے رموز نہیں سمجھ سکتے تو چپ رہو۔''

میں چپ ہو گیا اور مرزا نے کمرے کا ٹیلیفون اٹھا کر ہوٹل کے منیجر کو طلب کیا۔ میں صرف مرزا کا کلام سن سکتا تھا:

''میں ریحان مرزا بول رہا ہوں۔ ہم ابھی ابھی 25 نمبر میں اترے ہیں۔''

ذرا یہاں تشریف نہ لا سکیں گے؟

چلیں اسسٹنٹ منیجر ہی کو بھیج دیں۔

تھوڑی دیر کے بعد نہیں' فوراً' پلیز

شکریہ!

مرزا نے فون بند کیا اور لگے اسسٹنٹ منیجر کی راہ تکنے۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ دس گزر گئے مگر متوقع منیجر کا کوئی نشان نہ تھا۔ خفقان مرزا کا پارہ ایک سنٹی گریڈ منٹ کے حساب سے بلند ہونے لگا۔ کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک شخص دروازے کی چوکھٹ میں نمودار ہوا۔ مرزا نے اسے کچھ ایسی چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا گویا آتشی شیشے سے چھن کر نکل رہی ہوں اور کہا:

'تو آپ ہیں اسسٹنٹ منیجر اس علیشان ہوٹل کے؟''

'' آپ کے خادم ہیں جناب۔ ارشاد؟''

'' آپ کو آنے میں ایک مدت لگی ہے۔ راستے میں کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا تھا؟''

''جی میں سمجھا نہیں''۔

''میرا مطلب ہے دفتر سے یہاں آنے تک کسی بدخواہ نے آپ کو حبسِ بے جا میں تو نہیں رکھ لیا تھا؟''

''کیسی باتیں کرتے ہیں جناب؟ اس ہوٹل میں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔ فرمائیں' کیوں یاد فرمایا تھا؟''

مرزا' جن کی نگاہ فرش پر پڑے ہوئے ایک بہت ہی چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے پر مرکوز تھی۔ بولے

''میں ایک بات تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کمرے کی صفائی ہر روز ہوتی ہے یا ہر جمعہ یا صرف عید بقرعید کے موقع پر؟''

''جناب، روزانہ ہوتی ہے لیکن آپ چاہیں تو ایک بار پھر کرا دیتے ہیں۔ بھیجوں خاکروب کو؟''

''جی ہاں ضرور مگر خاکروب بھیجنے سے پہلے ذرا اس کمرے کی شمالی دیوار کو شرفِ ملاحظہ بخشیں گے؟''

''جی میں دیکھ رہا ہوں۔ ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔''

''اور وہ جو باریک سی دراز فرش سے لہرا کر چھت تک جا پہنچی ہے' اسے بھی کمرے کی صحت کی علامت سمجھتے ہیں؟''

''یہ دراز؟ یہ تو بہت پرانی ہے بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ سالانہ مرمت میں ٹھیک ہو جائے گی۔''

تو سالانہ مرمت تک آپ اپنے مسافروں کو کسی ناگہانی حادثے کے خلاف بیمہ کی سہولت بہم پہنچاتے ہیں؟''

''حضور' بیمہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آپ بلاخوف قیام فرمائیں۔''

''اگر بیمے کی سہولت بھی نہیں اور سالانہ مرمت بھی مستقبل بعید کی بات ہے تو ضرورت

پڑنے پر تجہیز و تکفین کا بندوبست تو آپ کرتے ہی ہوں گے؟''

''جناب زندگی اور موت تو خدا کے اختیار میں ہے لیکن اگر تقدیرِ الٰہی سے کوئی مسافر چل بسے تو ظاہر ہے آخری رسوم میں انتظامیہ حتی المقدور ہاتھ بٹاتی ہے۔''

''جزاک اللہ' جزاک اللہ۔ اور کیا آپ کے ہوٹل میں کوئی ایسا حادثہ فاجعہ ہو چکا ہے؟ خصوصاً اس کمرے میں؟''

''مدت ہوئی' ایک معمر مہمان غسل خانے میں پھسل کر جاں بحق ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد آج تک خدا کے فضل سے خیریت ہے۔''

''اس خیریت کی تو بڑی خوشی ہے لیکن یہ جو کمرے میں ہلکی ہلکی سی بو آ رہی ہے' کسی مرحوم گاہک کی تو نہیں؟''

''کمال کرتے ہیں جناب' یہ تو ڈی ڈی ٹی کی بو ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ کو ناگوار لگے گی لیکن آپ اس سے مانوس ہو جائیں گے اور رات بھر کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ ہو کر بے فکر سوئیں گے۔''

''رات تو ذرا بعد میں آئے گی۔ یہ دن دہاڑے جو ننھے ننھے کالے کالے پرندے اس کمرے میں محوِ پرواز ہیں' کیا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟''

''اسسٹنٹ یہ مچھر ہیں مگر ابھی مر جائیں گے۔''

''قبلہ اسسٹنٹ منیجر صاحب۔ ان کی موت و حیات بھی تو خدا کے اختیار میں ہے مگر مجھے تو ان مچھروں کے ڈیل ڈول سے یوں لگتا ہے جیسے آپ کا ہوٹل ایشیا کے مضبوط ترین مچھروں کی قیام گاہ ہے۔''

اسسٹنٹ منیجر نے بدستور بیانِ صفائی جاری رکھا:

''سر ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے ہمارے ہوٹل میں کچھ مچھر ہیں اور ان میں سے چند آپ کے کمرے میں بھی رہائش پذیر ہیں اور ہم یہ بھی مانتے

ہیں کہ ہمارا ہوٹل ایشیا میں واقع ہے لیکن یہ کہ یہ ہوٹل ایشیا کے مضبوط ترین مچھروں کا مسکن ہے' صریح مبالغہ ہے۔ کیونکہ دوسرے ہوٹلوں کے مچھر بھی اتنے ہی توانا ہیں۔''

''اور یہ جو کمرے میں داخل ہوتے ہی آپ کے کسی چمپئن مچھر نے میرے بازو پر طبع آزمائی فرمائی ہے اور یہ سرخ دہکتا آبلہ یادگار چھوڑ گیا ہے' اس کے متعلق کیا خیال ہے؟''...... یہ کہتے ہوئے مرزا نے اپنے لاغر بازو سے آستین ہٹائی اور وہ مقام دکھایا جہاں مچھر نے مبینہ طور پر زیادتی کی تھی۔ ویسے کوئی ایسا سرخ چھالا موجود نہ تھا۔ مگر منیجر نے خفقان کا بے جان سا بازو دیکھا تو بدک گیا اور میری ہنسی نکل گئی۔ بہر حال جب منیجر معافی مانگتے ہوئے خاموشی سے رخصت ہو گیا تو مرزا مجھ سے مخاطب ہوئے:

''چوہدری۔ یہ تمہاری ہنسی کس خوشی میں وارد ہوئی تھی؟''

''مرزا سچی بات ہے' مجھے ہنسنے کی بجائے رونا چاہئے تھا۔''

''وہ کیوں؟''

''اس مچھر کی بدنصیبی پر جس نے آپ کو کاٹا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' مرزا نے ذرا گرم ہو کر پوچھا:

''مطلب یہ کہ آپ کو کاٹنے سے غریب کو کیا حاصل ہوا ہوگا؟ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ فاقہ ہی کر لیتا اور اس گناہِ لذت سے بچ جاتا۔''

مرزا نے ایک لمحے کے لئے مجھے غیض سے دیکھا۔ اور بولے:

''تو گویا ایک دوست سے زیادہ تمہیں مچھر کے ساتھ ہمدردی ہے؟''

''میں معافی چاہتا ہوں مرزا' مگر انصاف کا تقاضا تو یہی ہے۔

''اچھا چوہدری۔ اب اگلے مچھر سے تم کٹوا لینا اور انصاف کی داد دیتے رہنا۔'' یہ کہا اور مرزا غسل خانے میں نہانے کی نیت سے داخل ہو گئے۔ لیکن بمشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ ننگے بدن پر تولیہ لپیٹے تیزی سے باہر نکلے اور مجھے حکم دیا:

''دبانا گھنٹی کا بٹن' ذرا جلدی۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''تم بٹن تو دباؤ۔''

بٹن دبایا تو اس دفعہ ایک بیرا نمودار ہوا جو دروازے کے باہر ہی کھڑا تھا' لیکن بجائے اس کے کہ اس سے مدعا بیان کرتے' مرزا نے حسب عادت ایک طنزیہ تمہید سے ابتدا کی۔

''آپ کی تعریف؟''

بیرے نے مرزا کو یعنی ایک مشتِ استخواں کو تولیئے میں لپٹا دیکھ کر نہ صرف ہنسی کو کامیابی سے روکا بلکہ باادب' باملاحظہ بولا:

''جی۔ میں آپ کا روم بیرا ہوں۔''

''ماشاءاللہ' ماشاءاللہ۔ تو روم بیرے ہیں آپ! یہ بتائیں کہ آپ کی سرپرستی صرف روم یعنی کمرے تک ہی محدود ہے یا غسل خانہ بھی آپ کی توجہ سے فیض یاب ہو سکتا ہے؟''

''جی میں سمجھا نہیں۔''

میں نے سمجھایا ''بیرے میاں! مرزا صاحب پوچھتے ہیں کہ غسل خانے میں کوئی خرابی ہو تو کیا اسے دور کرنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے؟''

بیرا بولا ''جی ہاں' ضرور' مگر خرابی کیا ہے؟''

مرزا بیرے کی پشت پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے غسل خانے میں لے گئے اور بولے:

''ذرا کھولئے پانی کی ٹونٹی۔''

بیرے نے ٹونٹی کھولی تو حسب معمول پانی آنے لگا پھر مرزا صاحب کا منہ دیکھنے لگا گویا کہتا ہو مجھے تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ میں بھی حیران تھا، چنانچہ میں نے کہا:

''مرزا' نلکے میں تو کوئی خرابی نہیں سوائے اس کے کہ تم پانی کی بجائے کوکا کولا کی توقع رکھتے ہو۔''

مرزا بولے: "چوہدری، پیشتر اس کے کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں، مجھے یہ بتاؤ کہ روم بیرے تم ہو یا یہ حضرت"

مرزا کی خفقانیت میں جلال آنے لگا تھا۔ میں نے غسل خانے سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھی مگر باہر کھڑا باتیں سنتا رہا۔ مرزا بیرے سے پوچھنے لگے:

"یہ گرم پانی کی ٹونٹی ہے لیکن پانی اس سے ٹھنڈا نکل رہا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ پانی گرم کرنے کے لئے آپ کوئلہ بھی جلاتے ہیں یا محض خوش فہمی کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں؟"

بیرا بولا: "آپ تھوڑی دیر کے لئے نلکا کھلا چھوڑ دیں۔ گرم پانی آنا شروع ہو جائے گا۔"

اور دو منٹ کے بعد ایسا ہی ہوا۔ میرا خیال تھا اب مرزا اطمینان سے غسل کریں گے اور بیرے کی جان بخشی فرما دیں گے۔ لیکن یہ میرا خیال تھا۔ مرزا صاحب کا خیال قدرے مختلف تھا۔ بیرے سے کہنے لگے:

"صرف ایک بات اور۔ یہ تولیہ جو میں نے لپیٹا ہے اور وہ جو دیوار سے لٹک رہا ہے، آپ کو میلے نہیں لگتے؟ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔"

بیرا بولا "حضور ذرا پھیکے رنگ کے ہیں ورنہ تازہ دُھلے ہوئے ہیں۔"

"تازہ دُھلے ہیں؟ کس چیز سے؟ کیا آپ کا دھوبی انہیں صابن سے دھوتا ہے یا صرف پُچھو سے؟"

"جی، تولیے لانڈری میں دُھلتے ہیں۔ بالکل ولائتی مشین ہے۔"

"ولائتی ہے؟ چلیں، پھر تو یہ سوال اقوامِ متحدہ میں اٹھانا پڑے گا۔" فی الحال یہ بتائیں کہ یہ تولیے جو گھس گھس کر ٹشو پیپر بن گئے ہیں انہیں بدلنے کے لئے ہوٹل کی انتظامیہ ہر چھ ماہ بعد میٹنگ کرتی ہے یا سالانہ؟"

بیرا بولا "آپ ٹھہریں، میں انتظامیہ سے پوچھ کر آتا ہوں۔" اور چل پڑا۔ یہ جواب بیرے نے بظاہر سادگی سے دیا مگر مرزا اس کی پُرکاری سمجھ گئے۔ جلال میں آ کر فوراً دروازے کی

اوٹ سے اپنے بدن سے لپٹا ہوا تولیہ اتارا جو اگلے لمحے میں ایک گولے کی شکل میں بیرے کی پشت پر نازل ہوا اور ساتھ ہی یہ ارشاد بھی کہ اسے انتظامیہ کو لوٹا دینا۔ چاہیں تو وہ اسے جھاڑن بنالیں یا اپنے ہوٹل کے تاریخی نوادرات میں شامل کر لیں مگر مجھے ایک متبادل تولیہ چاہئے جو ذرا موٹی ململ کے تھان سے کاٹا گیا ہو۔

قصہ مختصر تھوڑی دیر بعد بیرا ایک نیا تولیہ..... جو ململ کی بجائے اصلی تولیائی نسل سے تھا..... لے کر حاضر ہوا اور ہمارے یار خفقان مرزا نے خدا خدا کر کے غسل کیا۔

بیرا تولیہ دے کر واپس جانے لگا تو وہ سچ مچ سجدہ شکر میں تو نہ گر گیا' لیکن ایک لمحے کے لئے غریب نے آسمان کی طرف دیکھا اور فراغت کا ایک لمبا گہرا سانس لیا، جیسے کسی مصیبت سے آخر کار نجات مل گئی ہو۔ اگر چہ مجھے علم تھا کہ یہ بیرے کی خوش فہمی ہے۔

..... مرزا نے نکلنا بھی تھا۔ آخر نکلے اور اپنے تازہ دھلے ہوئے چہرے کی وجہ سے ذرا بہتر موڈ میں لگے۔ بولے!

''چوہدری' بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا نہ کھایا جائے؟''

یہی میرے دل کی آرزو اور میرے شکم کی آواز تھی' چنانچہ میں نے پُر زور تائید کی۔ لیکن مرزا بولے۔

''سوال یہ ہے کہ کھانا کھایا کہاں جائے؟''

''ڈائنگ ہال میں'' اور کہاں؟'' میں نے ڈائننگ ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ہمارے کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ مگر مرزا اکڑ گئے۔ بولے:

''تمہارا مطلب ہے اسی ہوٹل میں کھانا بھی کھائیں؟ ان بے توفیقوں کو مہمانوں کو نہلانے کا سلیقہ تو نہیں' کھانے کے آداب کیا جانیں گے؟ نیز مجھے یقین ہے کہ اس ہوٹل کے اکثر بیرے پاگل خانے سے بھرتی کئے گئے ہیں۔ یہاں کھانا نہیں کھائیں گے۔''

بھوک نے میرا ذوقِ طنز کچھ تیز کر دیا تھا۔ عرض کیا:

''جناب مرزا' آپ کو کسی ایسی طعام گاہ کا علم ہے جہاں کے بیرے یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہوں؟''

مرزا نے لاپروائی سے جواب دیا'' بھئی وہ تو پاگلوں سے بھی زیادہ بیکار ہوں گے۔ چلو مال پر چلتے ہیں۔ کسی پاش ریستوران میں لنچ کریں گے۔''

''بات ہوئی نا'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور دو تین چڑھائیوں اور اترائیوں کے بعد مال پر پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے مرزا نے پہلے ریستوران کو ہی شرف پسندیدگی بخشا اور اندر داخل ہو گئے۔ ریستوران میں خاصی بھیڑ تھی۔ مگر تھوڑے سے انتظار کے بعد ایک میز خالی ہو گئی۔ مرزا دوسرے امیدواروں کو چیرتے' مجھے آستین سے کھینچتے میز تک پہنچ گئے اور ہم کرسیوں پر قابض ہو گئے۔

مرزا نے حسب دستور بیرے کے لئے تالی بجائی۔ جواب میں بیرا تو نہ آیا۔ لیکن ایک سفید پوش اور ذرا مضبوط سا آدمی پاس سے گزرا جو تھا تو ہماری طرح ایک گاہک مگر مرزا اسے بیرا سمجھے اور اس کا بازو تھام کر بولے:

''میاں ہمارا آرڈر بھی لیتے چلو۔''

گاہک کوئی متحمل مزاج مگر ظریف طبع شخص تھا۔ جواباً اس نے مرزا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا:

''جناب آپ پدی کھائیں گے یا پدی کا شوربہ پئیں گے؟''

اور پھر مرزا کو جواب کا موقع دیئے بغیر' بولتا گیا:

''آپ ماشاءاللہ مسخرے تو اچھے ہیں مگر ہیں بہت دھان پان۔ پدی کے شوربے سے کہیں بدہضمی نہ ہو جائے؟''

یہ کہہ کر سفید پوش نے مرزا کا ہاتھ چھوڑا اور مسکراتا ہوا آگے نکل گیا۔

مجھے ڈر تھا کہ مرزا کہیں مشتعل ہو کر نکر نہ لے بیٹھیں یعنی مار نہ کھا بیٹھیں۔ لیکن مرزا کو اپنی سبکی اور غلطی کا بیک وقت احساس ہوا اور شاید کچھ اس شخص کے ڈیل ڈول سے بھی متاثر ہو چکے

تھے' خفیف تو خاصے ہوئے مگر بولے:

''چلو' معاف کر دیتے ہیں اسے۔ ہم نے اسے بیرا کہا تھا۔ اس نے ہمیں مسخرہ کہہ دیا۔ گویا یہ میچ ہار جیت کے بغیر ختم ہو گیا۔''

یہ سنا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مرزا نے زندگی میں پہلی مرتبہ ضبط سے کام لیا تھا ورنہ مجھے ڈر تھا کہ خالی پیٹ پٹ جائیں گے جو کچھ کھا کر پٹ جانے سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے؟ اتنے میں خوش قسمتی سے ایک حقیقی بیرا بھی آنکلا۔ اور ادب سے مرزا سے مخاطب ہوا!

''فرمائیں جناب! کیا کھائیں گے؟''

مرزا نے اب کے کسی تمہید کے بغیر جواب دیا۔

''پہلے ٹماٹر سوپ' پھر پلاؤ اور قورمہ اور آخر میں کوئی میٹھی چیز۔ مگر دیر نہ لگے۔''

''نہیں لگے گی حضور۔''

یہ کہہ کر بیرا ہوا ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ چند منٹ بعد اس نے گرم ٹماٹر سوپ کی دو پلیٹیں ہمارے سامنے لا کر رکھ دیں۔ میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ فوراً چمچہ اٹھایا اور ایک لمحے میں ساری پلیٹ پی جانا چاہا کہ مرزا بولے:

''ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ یہ سوپ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

ٹھیک تھا یا نہیں' بھاپ دیتا گرما گرم سوپ' اپنے کام و دہن سے فقط ایک بالشت دور' دیکھ کر جی چاہا کہ چمچہ ادھر پھینک کر پلیٹ منہ سے یا منہ پلیٹ سے لگا لوں اور ایک طوفانی کش لگا کر سارا سوپ سُڑک جاؤں لیکن حکم مرزا کیسے ٹالتا؟ ادھر مرزا سوپ کا بغور معائنہ کرنے کے بعد بیرے سے پوچھنے لگے!

''بیرے میاں۔ یہ بتاؤ اس سوپ کا ذخیرہ پاکستان بننے سے پہلے کیا گیا تھا یا بعد میں؟''

''تازہ بنا ہے' حضور!'' بیرا بولا۔ ''آج صبح ہی تیار کیا گیا ہے۔''

''دیکھو۔'' مرزا نے پکارا۔ ''میرے قریب آؤ اور سچ سچ بتاؤ۔ یہ سوپ اپنی پیدائش کے

بعد کتنے سوا بال سہہ چکا ہے؟''

''صرف ایک ابال' جناب۔ میں نے جو کچھ کہا ہے' سچ کہا ہے'' بیرے نے مئودبانہ کہا

''تو پھر'' مرزا جلال میں بولے۔''اس کا رنگ اتنا گدلا کیوں ہے؟ کیا باورچی اسی سُوپ میں غسل کرتا ہے؟''

بیرا احتجاجاً بولا'' آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جناب؟ یہ فائیو سٹار ریستوران ہے اور ہمارے خصوصی مہمانوں میں وزیر اور سفیر شامل ہے۔'' خفقان آرام سے بولے'' دیکھو' وزیر اور سفیر ایک دوسرا مضمون ہے۔ اس پر پھر کبھی بحث کرلیں گے' فی الحال یہ سوپ کی پلیٹیں واپس لے جائیے اور پلاؤ اور قورمہ لائیے اور دیکھیں بالکل تازہ ہوں۔''

میں نے اپنی سوپ کی پلیٹ جاتے ہوئے دیکھی تو یوں محسوس ہوا جیسے بدن سے روح پرواز کر کے بیرے کے ساتھ ہولی ہے۔ ایک دفعہ میں نے سنا تھا کہ ایک آدمی نے کسی بات پر اپنے بچپن کے دوست کو جان سے مار ڈالا تھا اور مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ آج خیال آیا کہ غالباً مقتول نے اپنے دوست کے سامنے سے سوپ کی پلیٹ اٹھوا دی ہوگی۔ بہر حال اب پلاؤ اور قورے کی نوید ارادۂ قتل پر غالب آگئی اور لگے بیرے کا انتظار کرنے...... آخر بیرا آتا دکھائی دیا اور جونہی اس نے میز پر کھانا چنا' ہم مرزا کی رسمی اجازت سے پہلے ہی پلاؤ پر پل پڑے اور ہر لقمے کے ساتھ وہ روح جو بدن سے نکل کر بیرے کے ساتھ چل دی تھی' لوٹنے لگی۔ مگر مرزا نے حسب عادت کھانے کے متعلق جرح شروع کردی۔ پلاؤ کی بوٹیوں کو ذرا مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر بیرے سے پوچھنے لگے۔

''یہ کس جانور کا گوشت ہے؟''

''بکرے کا حضور۔''

''یہ بکرا اپنی عمرِ طبعی سے کتنے سال تجاوز کر کے مرا ہوگا۔''

''بالکل نوعمر بکرا تھا' جناب اور مرا نہیں' ذبح کیا گیا ہے۔ آپ کھا کر تو دیکھیں۔''

مرزا نے بوٹی چکھی تو لذیذ پائی، چنانچہ بیرے کو اشارہ کیا کہ جاسکتے ہو اور خود پلاؤ سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دراصل مرزا کو مجھ سے زیادہ بھوک لگ چکی تھی۔ آخر صبح سے اب تک مجھ سے کئی گنا زیادہ' زبانی کسرت کر چکے تھے۔ زبان چلانا' خصوصاً مرزا کی رفتار سے' بل چلانے سے کچھ کم اشتہا افزا ورزش نہیں۔ چنانچہ مرزا پلاؤ کی پلیٹ سے مجھ سے بھی پہلے پار ہو گئے۔ اتنے میں بیرا تازہ روٹیاں لے آیا۔ جنہیں ہم نے قورمے کے ساتھ کھانے کی ابتدا کی۔ کیا لذیذ کھانا تھا!...... جناب مرزا بھی انگلیاں چاٹنے لگے اور اس وارفتگی سے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہیں میری انگلیاں بھی پکڑ کر چوس نہ لیں۔ سو یہ تھا عالمِ شوق قورمہ خوری کا اور یہ تھا سرور عالم خورد نوش کا...... کہ یکا یک مرزا کے منہ سے چیخ نکلی اور پلیٹ پیچھے ہٹا کر چلائے:

''بیرا' بیرا' بیرا''

بیرا بھاگا بھاگا آیا اور بولا ''حکم حضور۔''

''حکم یہ ہے کہ بلاؤ کسی ڈاکٹر کو' پیشتر اس کے کہ ہمیں کچھ ہو جائے۔''

''خیر تو ہے سر'' بیرے نے متفکرانہ پوچھا۔'' تکلیف کیا ہے؟''

''تکلیف بس اتنی ہے کہ آپ کے قورمے سے یہ مکھی برآمد ہوئی ہے''

بیرے کو جیسے دھچکا سا لگا۔ بولا ''مکھی؟ کہاں ہے۔ سر؟''

مرزا نے کانٹے کے ساتھ ایک کالی سی چیز اٹھا کر پلیٹ کے حاشیے پر رکھ دی اور اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں بولے۔'' یہ رہی آپکی فائیو سٹار مکھی۔ ویسے بڑی نفیس بھونی ہے آپ کے باورچی نے۔ بالکل کسی مہمانِ خصوصی کے قابل ہے''

''بیرے نے جھک کر دیکھا تو مسکرایا اور بولا۔''

''حضور گستاخی معاف۔ یہ تو لونگ کا دانہ ہے۔ ذرا ہاتھ لگا کر دیکھیں۔''

مرزا نے ہاتھ لگایا تو بے شک یہ لونگ ہی تھا۔ مرزا بڑے خفیف ہوئے یہ مرزا کی دوسری خفت تھی اور وہ بھی بیرے کے ہاتھوں اور کچھ بن نہ پڑا تو بیرے سے کہنے لگے:

''چلو ٹھیک ہے لیکن ریستوران کو پیشگی اعلان کر دینا چاہئے کہ ہمارے قورمے میں لونگ ڈالا جاتا ہے۔''

بیرے نے مجھے مسکراتے دیکھا اور مجھے آنکھ مارتے ہوئے مرزا سے کہنے لگا۔

''بہت اچھا حضور! یہ اعلان لکھ کر دروازے پر لٹکا دیں گے۔ ویسے اب ڈاکٹر کی ضرورت تو نہیں؟''

لیکن پیشتر اس کے مرزا بیرے کو جواب دیتے' ایک زنانہ آواز نے ہمیں اسلام علیکم کہا اور دیکھا تو سامنے خوبانی کھڑی تھی! ایک نہایت ہی رنگین جمال خوبانی جو جوتی سمیت پوشاک بدل کر ہوٹل سے نکلی تھی اور ہلکے میک اپ اور پر اسرار بوئے پیرہن میں یکسر حشر ساماں لگ رہی تھی۔

ہم دونوں نے اٹھ کر وعلیکم السلام کہا اور مرزا نے بیرے کو جواب دیا:

''اب تمہارے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ ہماری اپنی ڈاکٹر آ گئی ہیں۔''

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

**میر ظہیر عباس روستمانی**

03072128068

اس کتاب میں انگریزی زبان کے چند معروف اور چند غیر معروف مصنفین کے چھوٹے بڑے مزاح پاروں کے تراجم ہیں۔ میں نے ان کہانیوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک یہ التزام کیا ہے کہ ان کے کرداروں کو انگریزی ناموں کی بجائے پاکستانی نام دیئے ہیں۔ پس نظر (یعنی مقامات وغیرہ) بھی پاکستان میں مہیا کیا گیا ہے۔ نتیجتاً کہانیوں کا ماحول بھی فرنگی کی بجائے پاکستانی ہو گیا ہے۔ میں نے ایسا کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ عام پاکستانی قاری جو انگریزی زبان یا مغربی رسوم اور جغرافیے سے اچھی طرح واقف نہیں، کہانی کو پوری طرح سمجھ سکے۔ پاکستان میں انگریزی دان حضرات کی نسبت ایسے ہی قارئین کی کثرت ہے اور کچھ یہ بھی ہے کہ عام قاری کو ہیر رانجھے، شہوار اور سلمان کی کہانیاں مس لوسی اتھرنگٹن یا مسٹر رابرٹس ٹاملنسن کے افسانوں سے زیادہ دلچسپ اور اپنی زندگی کے قریب لگتی ہیں۔

کرنل محمد خان

ISBN: 978-969-496-471-3